محدث





مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن ۰ لاہور

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی مُدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہو رہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اجرائے مُحدث کے مقاصد

☜ عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین وسیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ **محدّث** لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!

کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

مُحدّث

مدیر معاون
عزیز زبیدی

لاہور

(فون) صدر دفتر: ۳۵۴۲۵۰ | ذیلی دفتر: ۵۴۸۷۳

جلد ۷ | شوال، ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ | عدد ۱۰، ۱۱

فہرست مضامین

۱۔	فکر و نظر	شدید بدمزگی اور لے دے کے بعد تشکیل اقتدار	اداریہ	۲
۲۔	الکتاب والحکمۃ ...	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	ادارہ	۹
۳۔	السنۃ والحدیث ...	بھلے کام کرنے کو کہو اور بُرے کاموں سے روکو		۱۳
۴۔	دار الافتاء	انتخاب کا شرعی طریقہ، دولہا اور دلہن کے الگ الگ نکاح خواں، حدیث نور		۱۹
۵۔	احکام و مسائل	عید کا چاند، جمعہ کے دن عید، مسجد کے لیے کنواں اور مال زکوٰۃ، اذان اور قرآن میں ذکر رسولؐ پر درود، کتاب و سنت کا پیرایۂ بیان ارذل عمر۔		۲۶
۶۔	نقد و نظر	محترم مدیر رسالہ محدث کی خدمت میں ایک مراسلہ	جناب کریم الدین صاحب	۴۱
۷۔		داڑھی۔ امام۔ مُلّا	جناب محمد اسمٰعیل ذبیح	۴۸
۸۔	تاریخ و سیر	حضرت زبیرؓ بن العوام۔ حواریٔ رسول	جناب طالب ہاشمی	۵۴
۹۔	شعر و ادب ...	فغاں مظلوم کی ظالم کے حق میں تیر ہوتی ہے (نظم)	مولانا عبدالرحمٰن عاجز	۱۸
۱۰۔	تعارف و تبصرہ کتب ...	پیارے نبی کی پیاری زبان عربی بذریعہ خط و کتابت	ادارہ	۷۲

ناشر: حافظ عبدالرحمٰن مدنی طابع: چودھری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس، ۴ ۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

زر سالانہ: ۶۰/۱۵ روپے

فی پرچہ: ۵۰/۱ روپیہ

فکر و نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شدید بدمزگی اور لے دے کے بعد تشکیل اقتدار

ملک میں سرد جنگ کی ایک غیر مختتم صورت۔ مغربی جمہوریت کا حاصل

اقتدار کی گدی، کانٹوں کی سیج ہے۔ اس سے بھی آزاردہ مرحلہ انتقال اقتدار کے لیے جنگ اقتدار کا مرحلہ ہے۔ اس دوران جو اشتعال، بدمزگی، کدورت، حسد، بغض و عناد، زنابت گردی، تلخی اور مسابقت کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، وہ اب دائمی شکل اختیار کر لیتے ہیں "جو کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے" پر منتج ہوتے ہیں۔ اپوزیشن کی اب ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ:

حکمران ٹولے کو اقتدار کا جو پیریڈ ملا ہے وہ اس میں بری طرح ناکام رہیں اور ان کو کسی طرح ایسی پٹخنی دی جائے کہ مستقبل کے ساتھ ان کا ماضی بھی ان کے لیے گالی بن کر رہ جائے، ان کی حسنات سیئات میں تبدیل ہو جائیں، مکرمات نضیحت دکھائی دینے لگیں۔ خوبیاں اور محاسن عیوب ہو کر رہ جائیں، جہاں ہنس سکتے ہوں وہاں بیٹھ کر روتے رہیں۔ قوم کو منہ دکھانے کے بجائے اپنا منہ چھپاتے پھریں۔

حکمران جماعت، جیت کر ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اس سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ حزب اختلاف کسی طرح بے اثر ہو کر رہ جائے، ان کے سامنے چوں نہ کر سکے، اگر وہ کام کا مشورہ بھی دے تو اسے ملک دشمنی کے مترادف بنا کر اس کے خلاف ذلیل قسم کی مہم چلائی جا سکے۔ ان کے رہنماؤں کی کردار کشی، ان کی سیاسی حکمت عملی کی جان بن جائے۔ اپوزیشن لیڈروں کے لیے قوم کے سامنے جانے کے سارے راستے بند کر سکے۔ اگر قوم تک پہنچنے میں وہ کامیاب ہو سکتے ہوں تو ان کو جیل خانوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند کرنا ممکن ہو جائے گو ابھی اقتدار کا پورا پیریڈ پڑا ہے تاہم حکمران لوگ اگلے انتخابات کے لیے ابھی سے اپنا راستہ صاف کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس کے لیے ان کو ملکی آئین کی روح کو پامال کرنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔ قانون کی مٹی پلید کرنے کی نوبت آجائے تو وہ اس میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انتظامیہ کو بے راہ کرنے کی ضرورت پڑ جائے

تو اسے یوں استعمال کر ڈالتے ہیں، جیسے وہ ان کے نجی ملازم ہوں۔ قومی خزانے اور ملکی دولت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے یوں تج دیتے ہیں جیسے وہ ان کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملی ہو اپنے جھوٹے وقار کے لیے قوم کو بے وقوف بنانے اور جھوٹے پروپیگنڈہ کی مہم چلانے میں بھی ان کو قطعاً کوئی شرم نہیں آتی۔ "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" کے اصول کے مطابق پوری ملت اور قوم کو منافرت و انتشار اور افتراق کی سان پر چڑھانے کی ضرورت پڑ جائے تو اس میں بھی حیا نہیں کرتے۔

ملک اور قوم کا جتنا بھلا ہو جاتا ہے وہ دردمندی اور اخلاص کا نتیجہ کم ہوتا ہے بلکہ قوم کو اس کا واسطہ دینے اور دکھانے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ کل قوم کے سامنے وہ کہہ سکیں کہ انھوں نے آپ کی خدمت کی ہے۔ حالانکہ قوم کی خدمت کا جذبہ وہاں مفقود تھا، یہ صرف کاروبار تھا یا سیاسی رشوت، تاکہ ان سے کل ووٹ کی ڈالی وصول کی جا سکے۔

ان کی خدمات اگر قابل ذکر ہوتیں اور قوم کو ان سے مناسب فائدہ پہنچا ہوتا تو تصنع کے مارے ان خادموں کو ان کا ڈھنڈورا پیٹنے کی قطعاً ضرورت نہ پڑتی کیونکہ وہ عطر ہی کیا جو دکاندار کے ڈھنڈورے کا محتاج ہو اور اس کی اپنی مہک اس کی غماز نہ ہو؟

بہرحال ان کے سیاسی کردار کا یہ پورا پیریڈ ان کے اسی جوڑ توڑ، فتنہ سامانی، ملک اور قوم کے مقدر سے کھیلنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ کام برائے نام والی بات رہ جاتی ہے، ورنہ کرسی کے ان بھوکوں سے ملک کی کوئی خدمت ہوتی ہے اور نہ قوم کی، ان کی زندگی کے شب و روز اس حیا سے بالکل عاری ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے ایک بہی خواہ کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہے اس لیے پوری قوم اپنے ان نمائندوں کی مکروہ ذہنیت، ناکام جتن اور سعی ناشکور پہ سراپا سوال بن کر رہ جاتی ہے کہ ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اس پر طرہ یہ کہ: متداول جمہوریت جہاں سے ہمارے ہاں منتقل ہوئی ہے وہاں تو اس کی ایک صورت بھی ہے، یہاں تو اس کے وارث وہ لوگ بنے ہیں جن کی اکثریت منافق، بدطینت کم سواد، کوتاہ بین، بدذوق اور بے اصول ہے، انھوں نے اس جمہوریت کی بھی مٹی پلید کر ڈالی ہے، جس کی کسی حد تک کافروں نے بھی لاج رکھی ہے۔ ان تمام تر حماقتوں کے باوجود ان کی خواہش ہوتی ہے بلکہ بہ جبر چاہتے ہیں کہ ان کو ان سیئات، مکروہ اور ناکام کردار کی بھی داد ملے۔

قرآن حکیم نے ان بدخود غلط لوگوں کی اس کور ذوقی پر کس قدر بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (پ ۴ - آل عمران ع ۱۹)

"جو لوگ اپنے کیے سے خوش ہوتے اور کیا کرایا تو کچھ ہے نہیں، اور اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو تو (اے پیغمبر!) ایسے لوگوں کی بہ نسبت ہرگز خیال نہ کرنا کہ یہ لوگ عذاب سے بچ رہیں گے بلکہ ان کے لیے عذاب دردناک (تیار) موجود ہے۔"

یہ عذاب دردناک آخرت میں بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں بھی۔ بلکہ ممکن ہے کہ دونوں جگہ ان کا یہی حشر ہو، کیونکہ "نیک اعمال" سے ان کی زندگی کی جیبیں خالی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود "داد" بھی چاہتے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہاں بھی اور وہاں بھی "عمل صالح" کی دولت ہی سے بگڑی بن سکتی ہے ـــ جب اس پونجی سے ہاتھ خالی ہوں گے تو ہاتھ ہی ملتے رہ جائیں گے۔

صحیح علاج یہ ہے کہ ملک میں آج کل کی جمہوریت کے مروجہ صدارتی اور پارلیمانی نظام کے بجائے "نظام خلافت اور نظام امارت" برپا کیا جائے اور اس کے سیاسی رہنما بھی صدر یا وزیر اعظم کی جگہ خلیفہ یا امیر المومنین کہلائیں ـــ ان اسماء گرامی اور القاب کا ایک نفسیاتی اثر بھی ہوتا ہے۔ ان خطابات کے حامل رہنما بالکلیہ "ننگِ القاب" نہیں ہو سکتے ـــ اور قوم کے لیے بھی ان کے انتخاب میں ان مبارک خصائص اور صفات حسنہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا ہے جو ان خطابات کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہر نتھو پھتو اس منصب کا امیدوار ہو سکے گا نہ اس پر کوئی براجمان ہونے کے لیے حوصلہ کر سکے گا۔

نظام خلافت پر مبنی نظام مملکت کا یہ قدرتی نتیجہ بھی ظاہر ہو گا کہ قوم کو اس "سرد جنگ" کی لعنت سے نجات مل جائے گی جس کے ہاتھوں پوری ملتِ اسلامیہ "فی سبیل اللہ فساد" میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور جس کی وجہ سے پوری قوم اور ملت شدید منافرت اور گروہی عداوت میں مبتلا ہو کر رسوا ہو رہی ہے۔

نظامِ خلافت اور نظامِ امارت قوم کو اس بے اطمینانی، غیر یقینی کیفیت، مخمصہ اور آئے دن کی باہمی دھکم پیل سے بھی چھٹکارا عطا کرتا ہے جو وقتی اقتدار، مستعار عنانِ حکومت

اور یہ سقہ والی سیادت کے تصور سے قدرتی طور پر دلوں سے ابھرتی اور ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ کیونکہ جو آج اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوتا ہے، اسے کل کی فکر آج ہی دامن گیر ہو جاتی ہے اس لیے ان ممکن رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اب سے ایسے پاپڑ بیلنا شروع کر دیتا ہے جو اس کی بدحواسی کی غمازی کرتے ہیں۔ ملک اور قوم کے مسائل حسبِ دستور انتظامیہ کی وجہ سے چلتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ صرف شاہزادگی کرتے ہیں۔ ان کا کام انتظامیہ کے کاموں کی صرف تشہیر رہ جاتا ہے یا ان میں بے جا مداخلت اور کچھ نہیں! اگر آپ غور فرمائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کا وجود ملک اور قوم کے دوشِ ناتواں پر بوجھ ہے، اور وہ آزار دہ حد تک شکنجہ میں کس کر باشندگانِ ملک کا کچومر نکالتے ہیں تاکہ اگلے سیزن کے لیے فضا سازگار ہو جائے۔ لیکن نظامِ خلافت و امارت میں خلیفہ کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ کام بھلے کرے یا برے، بہرحال اگلے پانچ سالوں کے بعد اسے جانا ہے ۔۔۔ بلکہ اب وہ دلجمعی سے کام کرتا ہے اور اپنے اقتدار کی کرسی کے استحکام کی فکر سے بے نیاز ہو کر ملکی اور قومی مسائل کے لیے یکسو ہو رہتا ہے۔ الّا یہ کہ مجموعی لحاظ سے پوری قوم اس کے کاموں سے غیر مطمئن ہو جائے، عوام اس سے ناخوش ہوں اور ملک اور قوم کی ساکھ گرنے لگ جائے تو اس وقت اس کو بدلنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اصل میں نظامِ امارت اور خلافت کی اساس "امانت و اہلیت" کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، امانت سے مراد وہ اخلاص ہے جو ملک و ملت اور دین کے لیے ان اقدار کی تلاش کرنے اور ان کو ملک میں برپا کرنے پر صاحب اقتدار کو آمادہ رکھتا ہے جو قوم کے حال اور مستقبل کی فلاح کے لیے مفید اور ضروری ہوتی ہیں۔

اہلیت سے غرض وہ سوجھ بوجھ اور ہمت ہے، جو ان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے مناسب اور ضروری ہوتی ہے۔

جو امیر المومنین یا خلیفۂ وقت ان اوصاف سے متصف ہو گا، ظاہر ہے اس کا وجود ملک اور قوم کے لیے گلے کا حسین اور مبارک ہار ہی ثابت ہو گا۔ اس لیے آئے دن قوم کو نئے انتخابی دردِ سر اور گروہی تلخیوں میں ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

جب ہم ایسے امیر المومنین اور خلیفہ کا تصور پیش کرتے ہیں تو لوگ قنوطی ہو جاتے ہیں کہ کیا اب ایسا حکمران امیر المومنین ڈھونڈے سے مل بھی سکتا ہے؟ گویا ان لوگوں کے نزدیک ملتِ اسلامیہ بالکل بانجھ ہے، اس کی کوکھ سے کوئی اہل اور بھلا آدمی پیدا ہی نہیں ہو سکتا

اور نہ اب اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہی رہ گئی ہے۔ یقین کیجیے! ہم اس کشتِ ویراں سے مایوس نہیں ہیں۔ اصل ضرورت بے لاگ چیکنگ کی ہے۔ اپنے سفلی اغراض میں تولنے کی نہیں ہے۔ ورنہ راستے اور تاریک ہوتے چلے جائیں گے، اور منزل کا سراغ لگانا اور دشوار ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اس طرف توجہ دی ہے تو لبِ بام کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

گو چیکنگ شروع ہو گئی ہے تاہم اس کا دائرہ زیادہ تر خواص تک محدود ہے، عوام نے خود جب امیدواروں کو کھنگالنا اور ٹھونک بجا کر دیکھنا شروع کیا، اس وقت مطلوبہ تطہیر ہو سکے گی۔ عوام ابھی "باتوں کے پھیر" میں ہیں، جب عوام ان کے ساتھ باتونی لوگوں کو ان کے عمل کے ترازوؤں میں تولنے کی کوشش کریں گے تو پھر ان کو سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ خود ہی بہت بڑے نقاد ثابت ہوں گے۔

غریبوں کے نام نہاد ہمدردوں نے عوام کو کچھ دیا نہیں لیکن ان کی طبقاتی حس کی تسکین کے لیے ان کو ایک نعرہ ضرور دیا، بس ان کو یہ "کھلونا" دے کر یوں بہلایا ہے کہ وہ کافی حد تک بہل گئے ہیں۔

دراصل طبقاتی عصبیت کی آگ اس قدر ظالم ہوتی ہے کہ الفاظ کی حد تک بھی اگر کوئی شخص اس کا مداوا کر دیتا ہے تو طبقاتی ذہن کی عید ہو جاتی ہے، گو اپنا بھی ناس ہو جاتا ہے تاہم ان کو اتنی سی بات سے تسکین حاصل ہو جاتی ہے کہ: ہمارے مخالف کا بھی کچھ نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے کہ:

گو اپنا بیٹا نیچے آ جائے، ویری کی دیوار ضرور گر جائے۔

یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے کہ غربا کا جو طبقہ نام نہاد عوامی نعرہ پر سر دھننے لگا ہے وہ اس لیے نہیں سر دھن رہا ہے کہ ان کو کچھ مل گیا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ جس کو وہ سرمایہ دار تصور کرتے ہیں بقول ان کے ان کو کچھ دھچکا لگا ہے۔ طبقاتی عصبیت کا یہ اعجاز ہے کہ کچھ وصول ہو یا نہ ہو، وہ دوسرے کے صرف "کچھ کھو جانے" سے خوش ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ بات کون نہیں جانتا کہ جتنے جدی پشتی نواب، جاگیردار، صنعت کار اور سرمایہ دار ہیں، ٹکٹ بھی ان ہی کو ملے ہیں اور وہی وزیر، وہی مقرب، وہی مشیر، وہی سرکار اور وہی درباری ٹھہرے ہیں۔ مگر طبقاتی ذہنیت کا ناس ہو کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ان کے صرف اتنے سے زبانی کلامی نعروں پر سر دھن رہے ہیں کہ ہم سرمایہ داری کا کچھ نہیں رہنے دیں گے۔ حالانکہ یہ اس قدر بڑا سفید

جھوٹ ہے جو اس آسمان کے نیچے اس سے بڑھ کر کبھی نہیں بولا گیا۔ بہر حال سرکاری اور خواص کے احتساب کے باوجود اگر عوام کو اس کے مطالعہ کے لیے تیار نہ کیا جا سکا تو شاید اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

ان حالات میں ہم چاہتے ہیں کہ

عصبیت کی آگ ابھی بھڑک رہی ہے، اور یہ آگ اندھی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے احتساب کے اس مختصر پیریڈ اور ٹائم میں ان کے فیصلے کا انتظار نہ کیا جائے۔ جس طرح بچے کا حال ہوتا ہے کہ ان کی خواہش کے علی الرغم اس کو سیدھی راہ کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ملک وملت اور دین کے بہی خواہ حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ حالیہ سکریننگ، احتساب اور چیکنگ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس کے مطابق اپنا فیصلہ صادر کر ڈالیں اور راتوں رات عوام کا استحصال کرنے والے گروہ کو عوام کے سامنے آنے سے بالکلیہ روک دیں اور وہ قانونی طور پر جس سزا کے مستحق نکلیں، اس سلسلے میں مداہنت سے بالاتر ہو کر، ان کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لیں، قاتل ہیں تو ان سے قصاص لیا جائے، خائن ہیں تو ان سے ملکی دولت وصول کر کے ان کو قید و بند کی نذر کر دیا جائے۔ اگر جاہ و منصب کو انھوں نے غلط استعمال کیا ہے تو ان کو ہمیشہ کے لیے انتخاب لڑنے سے محروم کر دیا جائے الا یہ کہ وہ تائب ہو جائیں اور ان کی زندگی کے شب و روز اس پر گواہ ہوں۔

فوج جو اس وقت ملک کے سیاہ و سفید کی مالک ہے بحالات موجودہ اگر اس نے "عوام کالانعام" کی رائے کا انتظار کیا اور جو کچھ دیکھا ہے، اس سلسلے کی اپنی دینی اور قانونی ذمہ داریوں کو پورا نہ کیا تو قیامت میں حکمرانوں سے اس کی سخت باز پرس ہو گی۔ عوام کو رہنمائی مہیا کی جاتی ہے، ان سے رہنمائی حاصل کرنا "گاڑی کو بیل کے آگے" لگانے والی بات ہے۔ اگر واقعی سابق حکمران ٹولہ مجرم ہے تو اس سے رعایت برتنا ویسا ہے جیسا سانپ کو دودھ پلانا۔ اور اس سلسلے میں جو مداہنت کی جائے گی اس کے نتائج انتہائی دور رس نکلیں گے۔ اس لیے حکمران طبقہ اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو اس کو "عدل فاروقی" کی یاد تازہ کر دینا چاہیے۔ جہاں نہ لایح اور نہ لومتہ لائم کا گزر ہو سکتا تھا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو، آپ ایسی مبارک فضا کا احیاء کر جائیں جس میں حدود اللہ کا نفاذ ممکن ہو سکے اور طاغوت کے دم خم ٹوٹ جائیں۔ یہ وہ صدقہ جاریہ ہے جس سے آپ کی اخروی زندگی آب و تاب پکڑے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

الکتاب والحکمۃ

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پ ۴ - ال عمران ع ۱۱)

"اور تم میں ایسے منظم لوگ بھی ہونے چاہئیں جو (لوگوں کو) نیک کاموں کی طرف بلائیں اور اور اچھے کام (کرنے) کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں، اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔"

امت مسلمہ صرف "کلمہ گو" جماعت نہیں ہے بلکہ یہ داعی الی الخیر بھی ہے، یہ بات اس کے دینی فرائض میں داخل ہے کہ نوع انسان کی دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سرخروئی کے لیے جو جو بھلے کام نظر آئیں، ابن آدم کو ان کے اپنانے کا درس دے اور اس کی مخالف سمت چلنے سے ان کو روکے۔

اس فریضہ سے کوئی بھی فرد مستثنیٰ نہیں ہے، جو جتنا اور جیسا کچھ کر سکتا ہے، ہر حال میں ادا کرے۔ مگر اپنے اپنے حسب حال، یہاں بھی، وہاں بھی، اب بھی، تب بھی، یوں بھی، ووں بھی، یہ اس کو، وہ اس کو، پوری درد مندی، اخلاص اور ایک دوسرے کو تھامنے کے جذبہ کے ساتھ تھام تھام کر چلیں۔ یہ بات صرف فریضہ نہیں، مسلمانوں کی مسلمانی اور اسلام دوستی کی نشانی اور تاریخ بھی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ (پ ۱۰ - التوبۃ ع ۹)

"مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں کہ نیک کام کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور برے کام (کرنے) سے روکتے ہیں، اور نمازیں پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلتے ہیں، یہی (وہ) لوگ ہیں جن (کے حال) پر عنقریب

اللہ رحم کرے گا۔"

نماز، زکوٰۃ اور اطاعت کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ: امر بالمعروف کرنے والا اور نہی عن المنکر کے اعتبار سے وہ خود ننگِ دین نہ ہو، بلکہ جو دوسروں سے کہتا ہو، اس پر اس کی اپنی زندگی بھی گواہ ہو، کیونکہ اس کے بغیر یہ احتساب دینی احتساب نہیں ہوتا اور نہ یہ تبلیغ دینی تبلیغ رہتی ہے بلکہ یہ استحصالی ہتھکنڈے ہوتے ہیں جو ایک دنیا دار بندے کی مکارانہ اور شاطرانہ چالیں ہوتی ہیں، جن سے ان کی غرض بندگانِ خدا کا سیاسی اور معاشی استحصال ہوتا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ایسے "ننگ خلائق" سے فرمایا:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (پ ۱ - بقرہ ع ۵)

"تم (دوسرے) لوگوں سے نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم کتاب (الٰہی) بھی پڑھتے رہتے ہو، کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے؟"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (پ ۲۸ - الصف ع ۱)

"مسلمانو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے (یہ بات) اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ کہو (سب کچھ) اور کرو (کچھ بھی) نہیں۔"

اصل بات یہ ہے کہ: جب آپ کسی سے یہ کہتے ہیں کہ میاں! یہ بھلے کام ہیں۔ ان سے دنیا اور آخرت، دونوں جہانوں میں بھلا ہوتا ہے، اور فلاں برے کام ہیں، ان سے بچو! دونوں جہانوں میں نقصان ہوتا ہے تو سننے والا یہ بھی دیکھتا ہے کہ:

اس فقیہ شہر اور محتسب کی زندگی کے اپنے شب و روز کیسے ہیں؟ موافق ہیں اور ان کے ان نتائج سے وہ متمتع ہو رہے ہیں تو اس کو مناسب تبدیلی کے لیے اپنے اندر ایک قدرتی تحریک کروٹ لیتی محسوس ہونے لگ جاتی ہے ورنہ وہ یہی تصور کرنے لگ جاتا ہے کہ یہ ایک ذہنی عیاشی ہے یا اس سے ان کی غرض بندوں کا استحصال ہے۔ اس لیے "عطائے تو بہ لقائے تو" (بات کہنے والے کے منہ پر مار کر اور) کہہ کر چل دیتا ہے۔

یہ استحصالی احتساب اور تبلیغ عموماً علماء سوء کا وطیرہ رہا ہے یا سیاسی بوالہوسوں اور کاروباری شاطروں کا۔ اس لیے ملک میں اس قدر چوکھی تبلیغ اور احتساب کے باوجود، کہیں

کوئی برکت اور حرارت دکھائی نہیں دیتی، آپ بھی زبانی کلامی چند بول، بول کر چل دیتے ہیں اور وہ بھی خالی خولی کانوں سے سن کر رفو چکر ہوتے ہیں، نہ آپ نے کچھ دیا اور نہ انھوں نے کچھ وصول کیا۔ پرنالہ جہاں تھا وہاں ہی رہتا ہے۔ خسروا الدنیا والآخرۃ۔

یہ تو وہ انفرادی دینی ذمہ داری کی بات ہے جو اپنے اپنے حسب حال سب پر یکساں عائد ہوتی ہے، گھر میں ماں باپ، دفتر میں شعبے کا انچارج، منڈی میں دلال، بازار میں دکاندار اور گاہک، عام حالات میں، جو جہاں اور جس حال میں کچھ کرنے کے قابل ہے۔ اسے یہ فریضہ بہرحال انجام دینا ہے۔

اس کی دوسری صورت "ہمہ وقتی" کی ہے، اس کے لیے فرمایا کہ: اس کے لیے ایک ٹیم ایک عملہ اور ایک گروہ تشکیل دے کر اسے اس کے لیے فارغ کر دیا جائے اور اس کا کام صرف تبلیغ اور احتساب ہو۔ اس لیے فرمایا۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔

اس کی دو صورتیں ہیں:۔

نجی حیثیت میں، اس صورت میں مسلمان رضا کارانہ طور پر نجی سطح پر اس کے مناسب انتظام کرتے ہیں، مثلاً تبلیغی جلسے کرنا، درسگاہیں قائم کرنا، انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے عوام کی رہنمائی کرنا وغیرہ۔

دوسری صورت سرکاری حیثیت کی ہے کہ، گورنمنٹ سرکاری حیثیت میں اس کے لیے کوئی معقول اور بااختیار بندوبست کرے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سب سے مؤثر ذریعہ بھی ہے اور معقول بھی۔ اسی لیے قرآن حکیم نے اسے اسلامی مملکت کے فرائض میں شامل کیا ہے چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج ع ۶)

"(صحابہ ایسے مسلم ہیں کہ) اگر ہم انھیں زمین میں استحکام دیں تو یہ لوگ نماز برپا کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کام کا حکم دیں اور برے کام سے منع کریں۔"

یہ ان مظلوم صحابہ کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے جن کو منکرین حق نے "جرم حق" کی پاداش میں گھر سے بے گھر کیا، ان پر ظلم ڈھائے، اذیتیں دیں اور دکھ پہنچائے کہ اگر ان کو اقتدار مل گیا تو وہ اپنی خدائی اور کرسی کے تحفظ کے خبط میں نہیں پڑیں گے بلکہ خدا کی غلامی اور وفاداری کو عام کریں گے اور اپنی سیاسی طاقت کے ذریعے اپنی سیاسی ساکھ کے استحکام

کے لیے لمحات اقتدار ضائع نہیں کریں گے، بلکہ اسے احکم الحاکمین کی تشریعی حاکمیت اور نظامِ حق کو برپا کرنے کے لیے صرف کریں گے ــــ خود اس پر چلیں گے اور دنیا کو اس پر کاربند رہنے کا درس دیں گے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ "سرکاری سطح" کا بھی ہے۔ افراد کی نجی حیثیت میں جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے وہ گو ضروری ہے اور مطلوب ہے تاہم وہ اپنے فریضہ سے عہدہ برآ ہونے والی بات ہے، اس سے عموماً نجی زندگی کے خاکہ میں رنگ تو بھرتا ہے لیکن اس سے ایک نظام کم برپا ہوتا ہے، ایک نظام کی حیثیت سے دین کو برپا کرنے کے لیے سیاسی طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاسی طاقتیں جب سے اپنے اس فریضہ سے ناطہ توڑا ہے اور غفلت برتی ہے، غیر سرکاری حیثیت میں طوفانی اور چو مکھی تبلیغ اور احتساب کے باوجود "اسلامی نظام" برپا نہیں ہو سکا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو تعارف تورات اور انجیل نے پیش کیا ہے اس کا حوالہ قرآن میں یوں ہے:۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (پ ۹ - الاعراف ع ۱۹)

"کہ وہ ان کو بھلے کام (کرنے) کو کہتے ہیں اور برے کام سے ان کو منع کرتے ہیں"

یہی صفت امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بھی بیان کی گئی ہے۔

الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ (پ ۱۱ - توبہ ع ۱۴)

"(لوگوں کو) نیک کام کی صلاح دینے والے اور برے کام سے منع کرنے والے۔"

تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جو ملت اسلامیہ کے بنیادی خمیر کا حصہ ہے ہمارے نبی پاک کا بھی یہی نشان اور یہی علامت آپؐ کی امت کی ہے۔ اگر ہمارا دامن اس ذمہ داری سے خالی ہو جائے تو پھر اور جو کچھ بنیں، بنتے رہیں لیکن "امت محمدیہ" نہیں کہلا سکیں گے کیونکہ وہ نشانی نہیں رہی۔

والدین کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس راہ پر ڈالیں کہ وہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" سے غفلت نہ برتیں، حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ (پ ۲۱ - لقمن ع ۲)

اے میرے بیٹے! نماز پڑھا کر اور لوگوں کو بھلے کام (کرنے) کو کہا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر۔

چونکہ اس راستہ پر چلنے والے کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دنیا مذاق اڑاتی ہے، طعن و تشنیع کے کچوکے دیتی ہے۔ ظلم ڈھاتی ہے اور جرمِ حق کی پاداش میں قتل تک کرنے سے دریغ نہیں کیا کرتی۔ اس لیے فرمایا کہ: ایسے مرحلہ پر صبر و ثبات سے کام لیں اور ہمت نہ ہاریں۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ (ایضاً)

"اور تجھ پر جیسی پڑے جھیل"

جو قومیں احتساب کا فریضہ ترک کر دیتی ہیں، وہ عموماً گندگی کا ڈھیر بن کر ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ تطہیر کے بغیر کوڑا کرکٹ جمع ہوتا رہتا ہے جو بالآخر انسانوں کو لے ڈوبتا ہے۔

امر بالمعروف سے مراد وہ کام ہیں شریعت نے جن کے کرنے کی سفارش کی ہے اور نہی عن المنکر سے مراد وہ امور ہیں جن کو اسلام اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دین اسلام کا اصرار ہے کہ بندہ مومن صرف اپنی گدڑی کی فکر نہ کرے، اسے دوسرے کی عاقبت اور کشتی کی بھی فکر کرنا چاہیے تاکہ گرداب بلا سے وہ بھی بسلامت پار ہو جائے۔

السنۃ والحدیث

بھلے کام کرنے کو کہو اور بُرے کاموں سے روکو

ورنہ ہمہ گیر عذاب کے لیے تیار رہو

عَنْ حُذَیْفَۃَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ (رواہ الترمذی)

"حضورؐ نے فرمایا مجھے اپنے مالک کی قسم ہے: تم بھلے کام کرنے کو کہو گے اور برے کاموں سے (لوگوں کو) روکو گے یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب مسلط کرے گا، پھر تم اسے پکارو گے مگر وہ تمہاری ایک نہیں سنے گا۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری رہے تو نیکی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اس لیے خدا کی طرف سے برکتوں کا نزول رہتا ہے، اگر اس فریضہ سے غفلت برتی جائے تو پھر بدی چھا جاتی ہے اور ملک میں بدوں کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لیے اندیشہ ہوتا ہے کہ اب رحمتوں کے بجائے عذاب الٰہی کا ہنٹر حرکت میں آجائے اور پھر اس کے سامنے کسی کی فریاد سے بھی کام نہ چلے۔

دراصل عذاب دیکھنے کے بعد عموماً توبہ اور ایمان کا اظہار بے اثر اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ الّا یہ کہ وہ عذاب محض جھنجھوڑنے کو آیا ہو، ان کا استیصال خدا کو ابھی منظور نہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ بَكْرِ نِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوْا مُنْكَرًا فَلَمْ یُغَیِّرُوْهُ یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ (رواہ ابن ماجۃ والترمذی)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: اے مسلمانو! تم اپنی خبر رکھو، جب تم راہِ راست پر ہو تو

کوئی بھی گمراہ ہوا کرے، تمہیں (کچھ بھی) نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(یقین کیجیے) میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ: جب لوگ خلافِ شرع ایک کام دیکھ کر اس کو نہیں بدلیں گے (تو) قریب ہے کہ ان کو اللہ کا عذاب آگھیرے۔ مقصد یہ ہے کہ: ع تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو ___ کا محاورہ غلط ہے۔ ایک اندھے شخص کو کنوئیں کی طرف بڑھتے دیکھتے رہنا اور اسے تھامنے کی کوشش نہ کرنا عقل کی بات نہیں ہے۔ بہر حال کوئی شخص خود خواہ کتنا ہی متقی ہو، اگر وہ خلافِ شرع کام پر چپ رہے تو عذابِ دنیا سے وہ بھی بچ نہیں سکے گا۔

آیت کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ: کسی کے گناہ کی بازپرس آپ سے نہیں ہو گی۔ جو کرے گا بھرے گا۔ گو متقی گناہ سے پرہیز کرتا ہے تاہم اسے برداشت تو کرتا ہی ہے۔ غور فرمائیں کیا یہ کچھ کم گناہ ہے؟

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اَوْحَی اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِلٰى جِبْرَائِیْلَ عَلَیْهِ السَّلَام اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَةَ کَذَا وَکَذَا فَقَالَ یَا رَبِّ اِنَّ فِیْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِكَ طَرْفَةَ عَیْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَیْهِ وَعَلَیْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَةً قَطُّ (مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ فلاں فلاں شہر کو شہر والوں پر الٹ دے تو عرض کی (حضور) ان میں آپ کا فلاں نیک بندہ ہے جس نے کسی لحظہ بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، حکم ہوا، بایں ہمہ ان سب پر شہر کو الٹ دو۔ کیونکہ میری خاطر ان کا چہرہ (ان کے کرتوتوں پر) کبھی بھی متغیر نہیں ہوا۔"

غرض تنہا تقویٰ و طہارت کافی نہیں ہے اس کے ساتھ ضروری ہے کہ ممکن حد تک نیکی کا پرچار اور بدی کی روک تھام بھی کی جائے۔ ورنہ وہی حشر ہو گا جو کبھی کسی صالح بندے کا ہوا کہ ہزار پرہیزگاری کے باوجود، خدا کی نافرمانیاں دیکھ کر اس نے کبھی اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کیا اور نہ کبھی کسی کو گناہ سے روکا۔ اور بالآخر تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہوا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ فِی الْمَعَاصِیْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ یَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ

فِي مَجَالِسِهِمْ وَاَكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ فَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاؤُدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (مشکوٰۃ)

"حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں، حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے ان کو روکا، مگر وہ باز نہ آئے (انھوں نے ان سے پرہیز نہ کیا بلکہ) اب ان کی مجلسوں میں شریک ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور پیتے رہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی اور یہ بہ سبب ان کے گناہ کرنے اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہوا۔"

دورِ حاضر کی یہ وہ سب سے بڑی بیماری ہے جس میں ہمارے عہد کے ریفارمر، مصلحین مبلغین اور علماء کرام عموماً مبتلا ہیں، جلسوں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سیاہ کاروں پر شدید برستے اور ان کو کوستے ہیں، لیکن جب موقع ملتا ہے تو ان کے ہمراہ بھی دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی دعوتیں قبول کرتے ہیں، ان سے میل جول رکھتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم پیشہ اور خدا کے نافرمانوں کو کچھ زیادہ فکر نہیں رہتی، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم شاید کچھ زیادہ راندۂ درگاہ نہیں ہیں یا یہ کہ، یہ واعظ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ پند و موعظت، ان کا پیشہ ہے کاروبار ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جو علماء اور ناصح قوم کے نا ہنجاروں سے ربط و ضبط بھی حسبِ معمول رکھتے ہیں، وہ دراصل بنی اسرائیل کے بد پیشہ علماء کا نمونہ ہیں اور اسی سزا کے مستحق اور سزاوار ہیں جس کے وہ تھے۔ جب تک یہ ناصح ان سے پرہیز نہیں کریں گے اور اپنی دینی غیرت کا ثبوت نہیں دیں گے ان کی تبلیغ بے اثر رہے گی۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّهٗ تُصِيْبُ اُمَّتِيْ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مِنْ سُلْطَانِهِمْ شَدَائِدُ لَا يَنْجُوْ مِنْهُ اِلَّا رَجُلٌ عَرَفَ دِيْنَ اللّٰهِ فَجَاهَدَ عَلَيْهِ بِلِسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَقَلْبِهٖ فَذٰلِكَ الَّذِيْ سَبَقَتْ لَهُ السَّوَابِقُ (مشکوٰۃ)

"فرمایا: اخیر زمانہ میں میری امت کو اپنے بادشاہوں سے سختیوں کا سامنا ہو گا، صرف وہی شخص بچے گا جس نے دین کا عرفان حاصل کیا، پھر اس کے لیے جہاد کیا، اپنی زبان سے، اپنے ہاتھ سے اور اپنے دل سے، بس وہ شخص بازی لے گیا۔"

ہر دور میں حکمرانوں نے دینِ حق کے علمبرداروں پر ظلم ڈھائے اور سخت اذیتیں دیں۔* مگر علمائے حق نے ہمیشہ ان دکھوں سے بے نیاز ہو کر حق کا بول بالا کیا ــــ خدا کے ہاں ایسے حکمران بہت بڑے غدار اور عہد شکن ہوتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: وَذَكَرَ اَنَّ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقَدْرِ غَدْرَتِهٖ فِي الدُّنْيَا وَلَا غَدْرَ اَكْبَرُ مِنْ غَدْرِ اَمِيْرِ الْعَامَّةِ يُغْرَزُ لِوَاءُهٗ عِنْدَ اَسْتِهٖ (مشکوٰۃ عن حدیث طویل)

کہا: اور حضور نے ذکر فرمایا کہ: کسی نے دنیا میں جتنا غدر کیا ہوگا اتنا اس کے غدر کا جھنڈا (کھڑا) ہوگا، دنیا میں سربراہ کے غدر سے بڑھ کر اور کوئی غدر نہیں ہے۔ اس کی مقعد کے نزدیک اس کا جھنڈا گاڑا جائے گا۔

غدر، عہد شکنی کی ایک قبیح صورت ہے، جو لوگ ملک اور قوم کے غدار ہوتے ہیں۔ ان کو اس لیے غدار کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کا جو عہد کیا تھا اس نے وہ توڑ دیا ہے۔ جو سربراہِ مملکت، قوم اس کے اونچے اخلاق اور اس کے دین کے سلسلے کی ذمہ داریوں کو دیانتداری سے پورا نہیں کرتا، وہ اصل میں اس "حلف وفاداری" کے عہد کی عہد شکنی کرتا ہے جو پہلے دن اس نے اٹھایا ہوتا ہے اس لیے وہ سب سے بڑا غدار ٹھہرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں واقعتہً ایسے ہی حکمرانوں سے سابقہ پڑا ہے۔ مگر افسوس! اس کو سمجھنے کی کم کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی جو ذمہ داریاں ہم پر یعنی عوام پر عاید ہوتی ہیں ان میں ہم ناکام رہے ہیں۔ خاص طور پر ہم نے ایسے غداروں کو سب سے زیادہ جو کمک پہنچائی ہے اس سے ہماری آخرت بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ دنیا ان زنگیلوں کی بنتی ہے، اپنی آخرت اور ایمان ہمارے عوام بیچتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عوام کا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی۔

خواص، یعنی ملکی اور قومی رہنماؤں اور سربراہوں کی بداعمالی اور سیاہ کاریوں کے وبال سے عوام اس وقت بچ سکتے ہیں، جب حسبِ مقدور غلط کاریوں کو ٹوکنے میں وہ اپنا فریضہ ادا کرتے رہتے ہوں، اگر اس کے بجائے وہ خاموش رہیں، تماشا دیکھا کریں یا ان سیاہ کاریوں کے باوجود ان سے تعاون جاری رکھیں تو پھر جو عذاب ان خواص پر نازل ہوگا، وہ ان تماشائی یا معاون عوام پر بھی نازل ہو کر رہے گا۔

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ حَتّٰى يَرَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ وَهُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّنْكِرُوْهُ فَلَا يُنْكِرُوْا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْعَامَّةَ وَالْخَاصَّةَ (مشکوٰۃ)

"یقین کیجیے! اللہ تعالیٰ ساری قوم کو بعض لوگوں (خواص) کے عمل کی وجہ سے عذاب نہیں کرتا۔ الا یہ کہ وہ اپنے سامنے خلاف شرع کام ہوتا دیکھیں اور وہ اس کو بدلنے اور روکنے پر قادر (بھی) ہوں مگر وہ اسے روکیں نہیں۔ تو اب جب ایسے کام ہوں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ عام اور خاص جمہور اور خواص سب کو دھر لے گا۔"

ہمارے نزدیک اس فتنے میں ہمارے ووٹر خاصے مبتلا ہیں اور جو عذاب ان خواص پر نازل ہوتا تھا اس کی لپیٹ میں یہ سب عوام بھی آرہے ہیں۔ خواص کی ناکردنیوں میں عوام کا خاصا حصہ ہے، بلکہ ان کے تعاون اور ووٹوں کی مدد سے ہی وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خدائی کے لیے خدا کی خدائی سے اعراض کریں۔ اس لیے ان ووٹروں کو سوچ لینا چاہیے کہ جب ان کے نمائندے غلط کام کریں گے تو اس گناہ میں سے ان کو بھی حصہ ملے گا تو اس وقت کیا کریں گے۔

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عليه وآله وسلم قَالَ مَنْ رَّاٰى مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (رواہ مسلم)

فرمایا: جو شخص خلاف شرع کوئی بات دیکھے تو اسے اپنی طاقت سے مٹا دینا چاہیے اگر یہ اس کے لیے ممکن نہ ہو تو زبان کے ذریعے اس کو روکنے کی کوشش کرنا چاہیے، اگر یہ بھی اس کے لیے ممکن نہ ہو تو دل سے ہی (اسے برا جانے) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے۔

پہلا فریضہ حکمران، ادارہ کے انچارج، والدین اور با اثر لوگوں کا ہے، کیونکہ وہ ایسا کر سکتے ہیں، اگر وہ نہیں کرتے تو اس کے دور میں، اس کے زیر سایہ جتنی سیاہ کاریاں ہوں گی، ان میں گناہ کا حصہ ان کو بھی ملے گا۔ ان کے سامنے جو جو قباحتیں آئیں اور جتنے مجرم ان کی نگاہ میں مجرم نکلیں۔ ان حالات میں یہ ان کے لیے قطعاً جائز نہیں ہوگا کہ وہ آنے والے نمائندوں کے لیے ان کو اٹھا رکھیں، کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہو؟ اس لیے وہ ان کی بیخ کنی جتنی اور جیسی کچھ خود کر سکتے ہیں، کر ڈالیں۔ ورنہ خدا کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی۔

دوسرا فریضہ عموماً مصلحین، علماء، مشائخ اور بزرگوں کا ہے کہ وہ مقدور بھر حکمت عملی

کے ساتھ لوگوں کو فہمائش کریں اور سمجھائیں اور زبان کے ذریعے ان کو ٹوکیں۔ ورنہ یہ بھی گنہگار ہوں گے۔

تیسرا فریضہ ان کمزوروں کا ہے جو زبان تک سے بھی کسی سے بات نہیں کر سکتے، ان کو نقصان اور اذیت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تو ان کو یہ کمزوری اس وقت ہضم ہو سکے گی جب وہ کم از کم دل سے اس برائی سے نفرت کریں اور برائی کا ارتکاب کرنے والوں سے بیزار رہیں۔

اسلام نے یہ تین درجے مقرر کر کے دراصل ہر بہانے باز کا راستہ بند کر دیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں ہے جو تیسرے فریضہ کی بھی ہمت نہ رکھتا ہو اگر مسلم ان اصولوں پر کاربند ہو جائیں تو یقین کیجیے! برائی کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہ ملے اور جو برائی باز ہیں وہ سر اونچا کر کے نہ چل سکیں۔ اللھم وفقنا لما تحب و ترضی۔

عبدالرحمٰن عاجزؔ مالیر کوٹلوی

فغاں مظلوم کی ظالم کے حق میں تیر ہوتی ہے

برے انسان کی ہر ایک جا تحقیر ہوتی ہے
تو نیکی کر کہ نیکوکار کی توقیر ہوتی ہے

یقیں تقدیر پہ رکھتا ہوں اور تدبیر کرتا ہوں
مری تدبیر بھی تو تابعِ تقدیر ہوتی ہے

زبان پہ بات لانے سے یہ پہلے سوچ لیں دل میں
نکلتی ہے زباں سے بات جو تحریر ہوتی ہے

مخالف جس قدر گفتار کے کردار ہوتا ہے
اسی مقدار سے گفتار بے تاثیر ہوتی ہے

ترے در پر پہنچ کر بھی زباں کھلتی نہیں میری
تجھے معلوم ہے کیوں شرم دامنگیر ہوتی ہے

کسی پر ظلم کرنا، اپنے اوپر ظلم کرنا ہے
فغاں مظلوم کی ظالم کے حق میں تیر ہوتی ہے

جسے سن کر ہر اک سامع کی کل دنیا بدل جائے
اُسے تقریر کہتے ہیں وہی تقریر ہوتی ہے

تقاضا ہے یہی حق کا وہاں حق بات کہہ ڈالو
جہاں حق بات کہہ دینا بڑی تقصیر ہوتی ہے

جو اہلِ عقل ہوتے ہیں، خطا کرتے نہیں قصداً
خطا قصداً کوئی ہو قابلِ تعزیر ہوتی ہے

خلافِ اسلام کے اُس کے قدم اٹھتے نہیں عاجزؔ
کہ جس کے پاؤں میں اسلام کی زنجیر ہوتی ہے

دار الافتاء

انتخاب کا شرعی طریقہ

ایک استفتاء آیا ہے کہ:

اگر انتخاب کا متداول طریقہ صحیح نہیں ہے تو اس کی صحیح اور شرعی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

یہ سوال راقم الحروف کے کسی سابقہ تحریر کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

الجواب

کتاب و سنت اور علماء کے افکار کے مطالعہ سے جو امور سامنے آئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

نظام امارت: اسلام میں مغربی جمہوریت اور نظامِ صدارت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی وہاں ڈکٹیٹر شپ کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ جمہوریت میں حکمران "عوام کالانعام" اگلتے ہیں اس لیے وہ انہی کی عینک سے دیکھتا اور دماغ سے سوچتا ہے اور اس کی حیثیت ایک فصلی بٹیرے کی ہوتی ہے وہ قوم کو ذہن دیتا نہیں لیتا ہے۔ ڈکٹیٹر شپ میں حکمران مسلط ہوتا ہے، لایا نہیں جاتا، اس لیے وہ اپنی ہانکتا ہے، کسی کی سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ اپنی مرضی کرتا ہے۔

اسلام میں ان کے بجائے "نظام امارت" ہے، جس کے حکمران امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کہلاتے ہیں۔

ان کا انتخاب ہوتا ہے مگر وہ ایسا شخص نہیں ہوتا جو اپنے انتخاب کے لیے مہم چلا سکے۔ اس کا انتخاب عوام کالانعام نہیں کرتے بلکہ خواص کرتے ہیں، خواص سے مراد مغربی خواص نہیں، مسلم خواص ہیں یہ خواص اور زعماء عوام کے منتخب نہیں ہوتے، منتخب روزگار ہوتے ہیں، اپنے علم، سیاسی سوجھ بوجھ تقویٰ اور تقدس کی بنا پر ان کو اپنی قوم میں قبولِ عام حاصل ہوتا ہے اور وہ مرجع خلائق ہوتے ہیں یعنی بخت و اتفاق کی پیداوار نہیں ہوتے۔ بہر حال وہ دو چار بھی ہو سکتے ہیں اور دس بیس بھی، وہ چالیس پچاس بھی ہو سکتے اور سو دو سو بھی۔ ان کو یہ قبولِ عام، دھن دولت یا اقتدار کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے فہم، طہارتِ نفس اور علم و ہوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ان خواص میں تینوں فوجوں کے سربراہ اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی اپنے منصب اور

عہدہ کی بنا پر شریک کیے جا سکتے ہیں۔

بہ حالات موجودہ : اس کے لیے مختلف مکاتیب فکر کے ان با اعتماد، صالح اور عظیم شخصیتوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جن کو ان کے ہاں سب سے زیادہ قبول عام، نیک شہرت اور جاہ و مرتبہ حاصل ہے۔

فرداً فرداً اس کی بیعت اور رائے دہی ساری قوم کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ بغیر کسی مہم جوئی اور ہنگامہ آرائی کے ہو جائے تو اس میں حرج بھی کوئی نہیں۔

عوام کی رائے اور ووٹ ضروری نہیں، ان کا اطمینان ضروری ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ: سواد اعظم کو اس سے گلہ اور شکوہ نہ ہو۔

ان زعماء کو جمع کر کے ان سے تفصیلی صلاح و مشورہ کرنے کے لیے فوجی سربراہ اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں۔ ان سے صلاح مشورہ اگر فرداً فرداً کیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس کے لیے کثرت رائے یا دلائل اور شخصیت کے وزنی ہونے کی بنا پر اپنے فیصلے کے اعلان کرنے کا چیف جسٹس کو حق ہو گا۔ گو اجتماعی مجلس میں مشورہ مفید ہوتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب مصلحت آمیز توافق یا باہمی مناقشات اور کشیدگی کا اندیشہ نہ ہو۔

انفرادی مشوروں میں "استصواب" کی شکل آزادانہ ہوتی ہے۔ کوئی کسی سے بدکتا ہے نہ جھکتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ پر اگر چیف جسٹس کو کثرت رائے کے پلے میں باندھنے کے بجائے بالکل عدلیہ کے طرز پر "دلائل اور شخصیت" کے وزن کی بنا پر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو کہیں بہتر رہے گا۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کے موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کیا تھا۔

اس کے بعد اس سے "حلف" لیا جائے۔ پھر تمام فوجی جرنیل، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور وفاقی حکومت کے چیف سیکرٹری اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

بعدہٗ امیر المومنین اپنی کابینہ اور شوریٰ امیر کے لیے مناسب اور اچھی شہرت کے حامل افراد کا از خود انتخاب کر کے کارِ حکومت کا آغاز کرے گا۔ اور اس وقت تک وہ اس منصب پر فائز رہے گا جب تک اس سے "صریح کفر" سرزد نہ ہو جائے یا ملکی مسائل اور عوامی شکایات کے حل کرنے میں وہ ناکام نہ رہے۔ ہاں شکایات کے سلسلے میں سپریم کورٹ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ البتہ ایک سربراہ مملکت کے انتخاب کے لیے کچھ شرائط اور

اوصاف کا تعین ضروری ہوتا ہے تاکہ ان کے آئینہ میں انتخاب کیا جا سکے۔

علاقوں کے لیے نمائندگی کا فریضہ، اس علاقے کا گورنر اور اس سے نچلی سطح پر ڈپٹی سی ادا کرے گا۔ اس کے لیے الگ کسی نمائندے کے انتخاب کا مسئلہ مفت کی سردردی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ: علاقہ کے نمائندے عموماً کارِ حکومت میں مداخلت کرتے ہیں۔ ہاں علاقے کے پڑھے لکھے اور سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقہ کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ اپنے مسائل حکومت کے نمائندے کے سامنے رکھیں۔ اگر وہ توجہ نہ دیں تو ان کے خلاف اوپر تک جانے کا اسے حق ہو گا۔ ہمارے ان مصنوعی اور کاروباری سیاسی نمائندوں کی بہ نسبت نامزد کردہ نمائندے زیادہ مفید رہیں گے کیونکہ اس طرح براہِ راست سربراہِ مملکت سے پاکستانی شہری کا رابطہ قائم رہ سکتا ہے۔

اگر انتخاب کا یہ بے ضرر طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے خاصا فائدہ ہو گا۔

۱۔ قوم مسرفانہ مصارف سے بچ جائے گی۔

۲۔ وقت کا ضیاع نہ ہو گا۔

۳۔ مہم چلانے کے مفاسد سے نجات مل جائے گی۔

۴۔ قوم "سرد خانہ جنگی" کے عذاب سے چھٹکارا پا جائے گی۔

۵۔ ملک و ملت کو اس دھڑا بندی کے مخمصہ سے بھی رہائی نصیب ہو جائے گی جس کو انہی سیاسی چھتروں کی وجہ سے قانونی جواز اور تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کے نزدیک، یہ دھڑا بندی انتہائی گھناؤنا فعل ہے۔

۶۔ حکمران اس فکر سے آزاد ہو کر اطمینان سے ملک و ملت کی خدمت کرے گا کہ اب (مثلاً) اگلے سال خدا جانے کون ہو گا۔ کیونکہ اس بے اطمینانی کی وجہ سے عموماً کارِ حکومت میں دلچسپی لینے کے بجائے وہ اپنے مستقبل کی تعمیر، ترقی اور تحفظ کے لیے خفیہ سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

۷۔ جن زعماء کے ذریعے امیر المومنین منظرِ عام پر آئے گا، ان کے واسطے سے ان کا عوام سے رابطہ مؤثر طریقے سے قائم رہے گا اور حالات سے باخبر رہنا ان کے لیے بالکل فطری ہو گا۔

۸۔ سازشوں کے چکر عموماً ان غیر محتاط سیاستدانوں کے دم قدم سے چلتے ہیں جن کو عوام کالانعام کے ذریعے قوم کے سیاسی افق پر نمودار ہونے کا بدقسمتی سے موقع مل جاتا ہے۔

۹۔ جن ملی زعما، عظیم قومی رہنماؤں اور ملک و ملت کے مزاج شناس پیشواؤں کے ذریعے

ملت اسلامیہ کو جو قیادت ہاتھ آئے گی انشاء اللہ بابرکت بھی ثابت ہوگی اور شریفانہ بھی، اسی کے ہاتھوں قوم کی بگڑی بنے گی، بنی بگڑے گی نہیں۔ کیونکہ جن کو وہ منتخب کریں گے، وہ ایک صالح، اہل علم، خدا ترس اور سیاسی بصیرت، کا حامل ہی انسان ہوگا۔ ان سے جو بھی جائز توقع کی جا سکے گی، امید ہے وہ ضرور ہی پوری ہوگی۔ انشاء اللہ۔

۱۰۔ سیاسی قیادت سے غرض، عوام کی مشکلات اور مسائل کو سمجھ کر ان کی خدمت کرنا ہوتی ہے عوام کو ان کی عامیانہ سوچ کا عوضانہ سمجھانا، عوام کشی کی بات ہے۔

۲۔ دلہا اور دلہن کا نکاح

ایک محترم خاتون تحریر کرتی ہے کہ:

کراچی میں، میں نے ایک میمن خاندان میں یہ دیکھا ہے کہ: دولہا کو باہر مرد اور دلہن کو اندر عورت نکاح پڑھاتی ہے کیا یہ جائز ہے؟

الجواب

نکاح پڑھانے سے اگر آپ کی یہ غرض ہے کہ، وہ ایجاب وقبول کراتی ہے تو بھی جائز ہے ایجاب وقبول کے سلسلے میں آپ یہ یاد رکھیں کہ:

ایجاب وقبول کے لیے صرف شہادت کی ضرورت ہے، کرانے کی نہیں۔ اگر ایک لڑکی اپنے طور پر لڑکے سے کہتی ہے کہ میں نے آپ سے نکاح کیا اور لڑکا کہہ دیتا ہے کہ میں نے قبول کیا تو بھی نکاح ہو جائے گا، یہ بات ضروری نہیں کہ دوسرا ایجاب وقبول کرائے، ہاں اس پر دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

لانکاح الابولی وشاھدی عدل رواہ احمد وفیہ ابن محرر وفی الباب احادیث یقول ببعضھا بعضاً (السیل الجرار ص۲۶۹)

آج کل ہمارے ہاں شادی کا جو طریقہ اور دستور رائج ہے وہ شاہدوں کی متوارث شکل سے بھی تقریباً بے نیاز ہو گیا ہے، کیونکہ شہادت سے غرض، اعلان ہے تاکہ خفیہ یارانوں پر پردہ ڈالنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور یہاں لڑکی اور لڑکے کی نکاح کی خبریں مہینوں پہلے بلکہ بسا اوقات سالوں پہلے عام ہو جاتی ہیں، صرف سرپرستوں کی بات نہیں بلکہ دوسروں میں بھی یہ

خبر خاصی مشہور ہو جاتی ہے۔ جہاں خبریں تواتر کی حد تک مشہور ہو جاتی ہیں وہاں روایتی شہادتوں کی ضرورت صرف سرکاری کاغذات کی خانہ پری کی حد تک باقی رہتی ہے یا صرف دستور کی آئینی خانہ پری کے لیے لیکن اس کے باوجود شہادت کی ضرورت رہتی ہے جیسے گو رمل کا وہ محرک اب نہیں رہا تاہم ہمیں اسے جاری رکھنا ہے، اسی طرح شہادت کا یہ سلسلہ بھی ہمیں جاری رکھنا ہے گو روحِ شہادت کا اتمام ہو گیا ہے۔

اگر نکاح پڑھانے سے آپ کی یہ مراد ہے کہ: دولہا کو کلمے پڑھائے جائیں، توبہ کرائی جائے وغیرہ تو یہ باتیں ویسے ہی غیر ضروری اور غیر شرعی ہیں ـــ نہ ہی ہوں تو بہتر ہے، چہ جائیکہ اس کے ہونے کے لیے کوئی محمل تجویز کیا جائے۔

ہاں نکاح پڑھانے سے اگر وہ خطبہ مسنونہ مراد ہے جو فریقین کے ازدواجی دور کی برکت یا ان کی فہمائش کے لیے دیا جاتا ہے تو یہ کوئی کرلے، کوئی خاتون کرلے یا مرد، دونوں جائز ہیں۔ کیونکہ یہ ایک دعا ہے یا نصیحت، سو وہ کوئی انجام دے ڈالے۔

۳۔ حدیثِ نور

جناب سیف الرحمان صاحب ضلع ساہیوال سے لکھتے ہیں کہ:

حدیث یا احمد کنت خلقت ادم بیدی فقد خلقته من طین وخلقتك من نور وجهی کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ حدیث کہاں ہے اور کیسی ہے؟ (مختصراً)

الجواب

اس قسم کی روایات، حدیث کے چوتھے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، چوتھا طبقہ وہ ہے جس میں صحیح کے ساتھ ضعیف اور موضوع روایات کا انبار لگا ہوا ہے اور یہ زبان زد عام ہیں مگر ان کی اسانید عموماً لا پتہ ہیں بلکہ بعض کا تو یہ حال ہے کہ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کس کتاب میں ہیں اور ان کے راوی کون کون ہیں۔

نور کے سلسلے کی جتنی روایات ہیں، منقطوع الاسانید منقول ہو رہی ہیں، اس لیے جو صاحب پیش کریں ان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ ان کی سند بھی پیش کریں تاکہ راویوں کو دیکھ لیا جائے۔

علامہ عبد الحی لکھنوی نے نور والی روایت کی تردید کی ہے ملاحظہ ہو (الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة ص ۳۲)

سب سے زیادہ مشہور ان کی روایت اول ما خلق اللہ نوری ہے۔ اس کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں اول ما خلق اللہ نوری کی روایت عام طور سے زبانوں میں جاری ہے مگر اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں ملا (صفحہ ۷۳۲)

ہمارے نزدیک یہ سب روایات بے اصل ہیں اور عیسائیوں کے مقابلے میں تراشی گئی ہیں۔ مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "ابن اللہ" کہنے سے تو رہے، اس لیے انھوں نے اپنی خوش فہمی کی تسکین کے لیے نور من نور اللہ کے نعرے ایجاد کر ڈالے ہیں اور پھر ان روایات کے سہارے جن کا کہیں بھی اتہ پتہ نہیں ملتا۔ اگر ان کے پاس ان روایات کی صحت کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت ہے تو مع سند اور حوالہ کتاب پیش کریں تاکہ ان کا حاصل معلوم ہو۔

اس کے علاوہ اخبار احاد (غیر متواتر حدیثیں) اعتقادی امور میں متقدمین کے نزدیک حجت نہیں ہوتیں، خواہ وہ کس قدر صحیح ہوں۔ امام تفتازانی لکھتے ہیں۔

ان خبر الواحد علی تقدیر اشتمالہ علی جمیع الشرائط المذکورۃ فی اصول الفقہ لایفید الا الظن ولا عبرۃ بالظن فی باب الاعتقادات خصوصًا اذا اشتمل علی اختلاف الروایات وکان القول بموجبہ مما یفض الی مخالفۃ ظاھر الکتاب (شرح عقائد)

یہ اس خبر واحد کی بات ہے جو صحیح ہو، لیکن ہمارے دوستوں کے ہاں جن روایات کا چرچا ہے ان کی سند تک نہیں ملتی۔ ایسی روایت سے ایسا اعتقادی مسئلہ ثابت کرنا جو کفر و ایمان کا مدار بنے، کہاں کا انصاف ہے۔ پھر علامہ تفتازانی کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر وہ روایت قرآن کے مخالف ہو تو وہ بالکل ہی بیکار ہے۔

وکان القول بموجبہ مما یفض الی مخالفۃ ظاھر الکتاب (شرح عقائد نسفی)

قرآن میں ہے: انما انا بشر مثلکم (کہف)

حیرت ہے کہ روایات وہ پیش کریں، تلاش ہم کر کے دیں یہ انصاف نہیں ہے۔ ان سے مطالبہ کریں کہ سند بھی دیں اور کتاب کا حوالہ بھی۔ خاص کر یہ روایات ان کتابوں سے تعلق رکھتی ہیں جو عموماً دستیاب نہیں ہوتیں۔ نہ قابل ذکر محدثین ان کی کوئی نشاندہی کرتے ہیں۔ بس مدارج النبوۃ دہلوی، دیلمی، حکیم ترمذی، عبد الرزاق، مواہب لدنیہ جیسی غیر ذمہ دار کتابوں کے یہ روحانی مشغلے ہیں، علمی سرمایہ نہیں ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ یہ سب روایات بیکار ہیں۔ ان روایات کا صحاح ستہ، مؤطا مالک، مؤطا امام محمد۔ مسند ابی حنیفہ، مسند شافعی، مسند احمد، مسند ابی داؤد،

طیالسی، ابن الجارود، طحاوی، ابوعوانہ طبرانی، مجمع الزوائد، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ جیسی شہرۂ آفاق کتابوں میں سے کسی بھی کتاب میں ان کا سراغ نہیں ملتا۔ اب کوئی کیسے بتائے کہ یہ کیسی روایت ہے۔

نور کا عقیدہ رکھنے والے دراصل محمد عربی فداہ ابی وامی صلعم کی بعثت اور نبوت کی تکذیب کے سامان کر رہے ہیں، کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اس کو اپنی ہم جنس انسان کی طرف بھیجا ہے جب وہ ابنائے جنس نہ رہے تو وہ نشانی نہ رہی کہ ہم ان کی تصدیق یا ان کو تسلیم کریں۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ: حضور اللہ کے نور سے اور باقی مخلوق نبی کے نور سے بنی ہے۔ اگر اللہ کے نور سے پیدا ہو کر نبی نور بنے ہیں تو جو نبی کے نور سے بنے ہیں وہ کیوں نہ نور ہوں۔ گویا کہ ہم سب نوری، کیا ہی کہنے؟ اس کے علاوہ اللہ کے نور سے بننے کے معنی ہوئے کہ وہ خدا کا ٹکڑا ہے اور خدا کے حصے بخرے ہو سکتے ہیں۔ رسول کی فضیلت ثابت کرتے کرتے خدا کا بیڑا غرق کر ڈالا ہے۔ انا للہ۔ بہرحال ان مسائل میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اب خلق خدا کو اس نظام حیات کی طرف توجہ دلائیں جو دینِ حق چاہتا ہے۔ ان مسائل سے مدت ہوئی علماء فارغ ہو چکے ہیں۔ اب ان کا پیچھا چھوڑ دیں۔ کتاب و سنت کی تعلیم عام کریں۔ یہ خوش فہمیاں خود بخود کافور ہو جائیں گی۔

تجدیدِ میثاق

ہم عہد کرتے ہیں کہ آئندہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق بسر کریں گے اور اس کی نافرمانی سے بچیں گے۔ نیز ہم پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ جلد از جلد نافذ کرنے کی پوری جدوجہد کریں گے تاکہ نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں ہماری زندگیاں کتاب و سنت کے مطابق بسر ہوں۔

مطالبہ: اسی تجدیدِ عہد کے تحت ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب جنرل ضیاء الحق صاحب سے بھی مطالبہ کریں کہ وہ بلا تاخیر پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا اعلان کریں کیونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ملک و ملت کے وابستگان کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں یکسانیت ہو بلکہ فرد کی جدوجہد میں معاشرتی اداروں کا جہاد بھی شامل ہو۔ ہم اس سلسلہ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، حکومت پاکستان اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اپنی مکمل اعانت کی پیشکش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حکومت پاکستان کو اپنے اولین فریضہ سے جلد عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

مجلس التحقیق الاسلامی۔ لاہور / انجمن خدام الاسلام۔ لاہور

احکام و مسائل

عید کا چاند

انگلینڈ سے ایک فاضل نے استفسار فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

یہاں پر حسب سابق اس دفعہ بھی عید پر مسلمانوں میں خاصا اختلاف پیدا ہوا اور تین مختلف دنوں میں عید کی گئی اور اس سلسلے میں تین گروہ بن گئے۔ اس مسئلے پر میں آپ کا نقطۂ نگاہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ صورتِ حال کچھ اس طرح بنی۔

پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے اور انگلینڈ کا مطلع مراکش کے قریب ہے۔ لہٰذا مراکش کی اطلاع کے مطابق روزہ رکھا جائے اور عید کی جائے۔ اس گروہ کی قیادت دیوبندی علماء کے ہاتھ میں ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ پاکستان کی خبر کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ ان کے پاس کوئی خاص شرعی دلیل نہیں ہے۔ اس گروہ کی قیادت بریلوی پیروؤں کے پاس ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ برطانیہ میں مطلع سال بھر ابر آلود رہتا ہے، اس لیے یہاں رؤیت کا ثبوت ممکن نہیں۔ اس لیے کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور جب مطلع کے اختلاف کے بارے میں کوئی واضح شرعی دلیل نہیں ہے تو یہاں کے مسلمانوں کو جہاں سے بھی پہلے خبر مل جائے اس کی تصدیق کر کے قبول کر لینا چاہیے اور یہ خبر اکثر سعودی عرب سے ہی آتی ہے۔ اس لیے سعودی عرب کی پیروی کرنی چاہیے۔ یا جس اسلامی ملک میں پہلے رؤیت ثابت ہو جائے۔ یہ سعودی عرب سے آئے ہوئے اہم دعاۃ کا موقف ہے، اس موقف کی تائید یہاں یوکے اسلامک مشن (جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم) اور جمعیت اہلِ حدیث اور پڑھے لکھے حلقوں نے کی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ سعودی عرب میں شرعی نظام نافذ ہے اور وہ تمام مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے۔ اس لیے برطانیہ کے مسلمانوں کو وہاں کی رؤیت غیر مشروط طور پر تسلیم کر لینی چاہیے۔

اس بارے میں آپ بھی اپنی علمی تحقیق سے مستفید فرمائیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس موضوع پر خوب بحث کی جائے اور یہاں کے مسلمانوں کو کسی ایک نکتے پر متحد کیا جائے۔

(لندن - برمنگھم ۸ - ۲۵ ستمبر ۱۹۷۷ء)

الجواب

خط میں جس حد تک گنجائش تھی اس کی تفصیل عرض کر دی گئی ہے، جس کو یہاں مزید قدرے تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہوالموفق والیہ انیب۔

اختلاف۔ علمی اور تحقیقی امور میں اختلاف برا نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ شکست و یار کا موضوع بن جائے تو ملتِ اسلامیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اس کی عافیتوں کے لیے اور کوئی غارت گر شے بھی نہیں ہے۔

ہم جب اختلاف کی درازی عمر اور اس کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ علمی کی بجائے تقلیدی زیادہ نظر آتا ہے، جو بہر حال محمود نہیں ہے۔ فقہی مسائل میں اختلافات کا پس منظر بھی عموماً یہی رہا ہے۔ اگر علمی ہوتا تو آج تک جتنی ان مسائل پر لے دے ہوئی ہے تو وہ منقح ہو جاتا اور ملی وحدت کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا۔ چونکہ اس اختلاف کے پس پردہ "فرقہ وارانہ" ذہنیت کا ہاتھ رہا ہے، اس سے اس اختلاف سے "ائتلاف" کے امکانات روشن ہونے کے بجائے اور یہی اختلافات بڑھے ہیں اور ایک فن بن کر بڑھے ہیں اس لیے ان کی تحقیق و تدقیق برکت سے محروم رہی ہے۔

پہلا گروہ۔ دیوبندی علماء کرام نے جو موقف اختیار کیا ہے گو وہ صحیح ہے تاہم وہ ان کا نجی نکتۂ نظر ہے، ان کا سرکاری مسلک نہیں ہے کیونکہ حنفی فقہی نظریہ یہ ہے کہ: اختلاف مطالع کوئی شے نہیں ہے۔

ولا اعتبار باختلاف المطالع حتی لو رأی اهل المغرب هلال رمضان یجب بروٴیتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب (مجمع الانهار- مصری)

لیکن "طریق موجب" (یقین اور استفاضہ) کے لیے انھوں نے جو شرائط اختراع کی ہیں ان کے یہ معنی بنتے ہیں کہ ع

نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی

اس کے بعد "مراکش" تو بڑی بات ہے، خود انگلینڈ اور اس کے مضافات کے لیے رؤیت ہلال کا ثبوت بھی جوئے شیر لانے والی بات بن جاتی ہے۔

دنیا میں ایک گھپلا، علمی شاہراہ بن گیا ہے کہ ملک میں اگر چاند ہو تو اسے سارے ملک کے لیے ہلالِ عید تصور کیا جائے، اگر نہ ہو تو اسے اس کے کسی حصے کے لیے بھی "ہونا" تصور نہ کیا جائے۔

حالانکہ خدا نے "چاند" کو علاقائی بنیادوں پر نہیں پھیلایا بلکہ اسے دنیا پر دراز کیا ہے لیکن "حصہ رسدی" کے مطابق "جہاں جہاں" اس کا ظہور ہو، وہاں وہاں عید منائی جائے۔ دوسرے اس کی آمد اور ظہور کا انتظار کریں۔ بالکل یوں جیسے نماز کے اوقات کا رکی بات ہوتی ہے کہ جب جہاں وقت ہو جائے، وہ وقت کے مناسب نماز ادا کر لیں، دوسرے اس کے آنے کا انتظار کریں۔ ایسا نہیں کہ حجاز میں مثلاً اگر نماز ظہر کا وقت ہمارے وقت کے مطابق دن کے دس بجے ہو گیا ہے تو ہم کو بھی دس بجے ہی نماز ادا کر لینی چاہیے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح سورج سے ہمارے اوقات وابستہ ہیں اسی طرح چاند کا بھی معاملہ ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (پ۲۔ بقرہ ع۲۳) اس لیے ہم کہتے ہیں کہ مثلاً اگر جدہ اور کراچی کا مطلع ایک ہے تو ان دونوں کو چاند ہونے پر آج عید کر لینی چاہیے۔ دوسرے کو اگلے دن اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ چاند پر علاقوں کو تقسیم کیجیے، چاند کو علاقوں پر تقسیم نہ کیجیے! کیونکہ یہ قلب موضوع کی مکروہ شکل ہے۔

دوسرا گروہ۔ گو ان کے پاس دلیل نہیں ہے تاہم حنفی مسلک یہی ہے لیکن ان کا یہ بے تکا پن کہ: پاکستان کی خبر کے مطابق عمل کرنا چاہیے، ان کی روایتی بے ڈھنگی کے عین مطابق ہے کیونکہ جب مطالع کا اعتبار ساقط ہو گیا تو پھر پاکستان کی قید فضول ہے کیونکہ چاند کہیں ہو ان کے مسلک کے مطابق جب "بطریق موجب" اس کی اطلاع مل جائے تو سب کو ہر جگہ عید کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ فاصلہ مشرق و مغرب کا فاصلہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "طریق موجب کے ساتھ" یہ خبر کس طرح موصول ہو سکتی ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، تار وغیرہ؟ مگر احناف کے نزدیک یہ ذرائع قابلِ اعتبار نہیں، اگر اس کا اعتبار کر بھی لیا جائے تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ عید کا مدار شہادت پر ہے جس میں "اشہد" (میں گواہی دیتا ہوں) کہنا شرط اولیٰ رکن ہے۔ اب اس کے لیے وحی الٰہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے، بشرطیکہ "عید" کے اس مخمصہ سے نکلنے کے لیے کسی نئے نبی کا سلسلہ جاری کیا جائے۔

باقی رہا ان کے ہاں "عدم دلیل" کا رواج؟ سو وہی ان کی "تقلید" کی جان ہے۔ اگر دلیل آگئی تو یہ مارے گئے۔ "تقلید دم توڑ دے گی اور عقل و ہوش سے عاری ان کی رسومات اور اوہام کا جنازہ نکل جائے گا۔ فقہاء کے نزدیک بھی "عدم دلیل" تقلید کا جزو ہے۔ باقی رہے کتاب و سنت کے ان کے نعرے؟ تو وہ گرمی محفل کے لیے ہیں یا محض جذباتی!

تیسرا گروہ۔ جس کے وہاں کے اہلحدیث، جماعت اسلامی اور آپ نقیب ہیں، وہ بھی

دلیل سے خالی ہیں۔ نہ ہی کسی فارمولے کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ ہاں جن اسلامی ممالک کا آپ نے نام لیا ہے اور جس سدا بہار "ابرو باد" کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی مطالع کا اعتبار ہے نہ فان غُمّ علیکم فاقدروا لہ (بخاری) کے لیے وہاں کوئی گنجائش محسوس کی جاتی ہے؛ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ان کے موقف کی اساس اور کیا ہے؟

راقم الحروف کے نزدیک یہ موقف بھی محل نظر ہے، کیونکہ اختلاف مطالع کو نظر انداز کرنا دراصل حدیث صُومُوا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ (بخاری) کے مصداق پر پانی پھیرنے والی بات ہے۔ حدیث میں جس رؤیت کا ذکر ہے اس سے مراد چاند کا وہ دائرہ ہے جہاں وہ نمودار ہو کر دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر "لرؤیتہ" کی قید ایک تکلف ہے جو ایک فرضی ہالہ کے گرد گھوم رہا ہے۔ حالانکہ اسلام اور اس کے علمی فرامین "خیالی پلاؤ" کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے جس کا خارج میں مصداق محسوس اور مشہود ہونا چاہیے۔

ہم اس بات پر حیران ہیں کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ "جہت مغرب" کے اقصیٰ میں جو ممالک آتے ہیں، وہاں ان ممالک سے پہلے چاند نمودار ہوتا ہے جو مشرق اقصیٰ میں ہیں تو پھر اس فارمولے کے مطابق "رؤیت قمر" کی سرورداری تو صرف "جہت مغرب" میں آباد ممالک کے لیے رہ جائے گی، ہمیں تو بنی بنائی عید ہاتھ لگ جایا کرے گی؛ کیونکہ ازل سے چاند کا یہ تعامل معروف ہے۔ اس میں قطعاً کوئی ریب اور شک نہیں ہے۔ نہ ایسے بدیہی حقائق کیلیے روایتی "تثبت" کی تلاش مناسب ہوتی ہے۔ کما جاء فی کتب الاصول۔

جب جہت مغرب میں کسی جگہ عید یقینی ہو جاتی ہے تو آپ کو کیا پڑی ہے کہ آپ یہاں "ہلال کمیٹیاں" تخلیق کرتے پھریں یا گواہ ڈھونڈھتے پھریں۔ اختلاف مطالع سے صرف نظر ایک غیر فطری اور غیر عقلی گورکھ دھندا ہے جو ایک دانشمندانہ اقدام کی اساس نہیں بن سکتا۔ حیرت ان فقہاء پر ہے جنھوں نے چاند ہونے کی راہ کے تمام حجابات اٹھا دیے ہیں لیکن اس سے استفادہ کرنے کے لیے "راہ میں" شرائط کے حجابات کے وہ پہاڑ کھڑے کر ڈالے ہیں جن کو دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر خود چاند بھی یہاں سے گزرے گا تو یقیناً اس کو بھی بریک لگ جائے گی، وہ راستہ بند پاکر واپس پلٹ جائے گا۔

الغرض: اختلاف مطالع کے سارے حجابات اٹھا کر چاند سے مصافحہ کرنے کے لیے راہ صاف کر دی لیکن شرائط کے حجابات کے پہاڑ کھڑے کر کے پھر اس راستہ کو پاٹ دیا ہے گویا کہ

اس ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

غور فرمائیے! وہ فرماتے ہیں کہ اس چاند کے لیے "خبر" بھی کافی نہیں شہادت ضروری ہے، پھر فرماتے ہیں۔ اس کے لیے ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، تار اور کشف و رؤیا کی اطلاع بھی مفید نہیں کیونکہ وہ خبر دیتے ہیں، شہادت نہیں دیتے۔ شہادت کے لیے جو شرائط ہیں، ان کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لیے کوئی شبلی اور جنید ہی ہو تو کام چلے گا ورنہ نہیں۔ پھر شہادت علی الشہادت یا شہادت علی قضاء القاضی کے جو چکر چلے ہیں، ان میں پڑ کر چاند کا ہوش کہاں، خود ہی انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ: دنیا میں آئے ہو اور یہاں رہنا ہے تو کچھ عقل و ہوش سے بھی کام لینے کی اجازت دی جائے۔

باقی رہا "بادلوں" کا سدا چھایا رہنا؟ اگر کبھی کسی مہینہ میں کوئی چاند نظر نہیں آتا تو یہ واقعی اضطرار ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک اس کے حل کی یہ دو صورتیں ہیں۔

وہ علاقہ پاس کے جس ملک کے ساتھ "مطالع" میں وحدت رکھتا ہے وہ اس کے تابع رہے۔ مثلاً انگلینڈ کا سارا ملک تو نہیں لیکن اس کے بعض اضلاع کا مطلع اگر پڑوس کے ملک کے مطالع کا حصہ ہے تو اس ہیں جب عید ہو جائے، اگلے دن انگلینڈ کے باقی ماندہ ان علاقوں کو عید منا لینی چاہیے جن کا مطلع ایک ہے اور پڑوس والے ملک سے منفصل ہے۔

دوسرا یہ کہ وہ تقویم سے کام لیں، گو یہ عام حالت میں جائز نہیں ہے تاہم اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کیونکہ یہ اضطراری صورت ہے۔ اگر فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُم والی حدیث پر عمل کیا جائے تو یہاں کی ہجری تقویم کا تیا پانچہ ہو جائے کیونکہ ہر ماہ، ماہ کے تیس دن شمار کر نا سال کے ڈھانچہ کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہے گا۔

حدیث: انا امة امية لا نكتب ولا نحسب (بخاری) سے مراد، اہل عرب، بالخصوص قریش کی حالت واقعی کا ذکر ہے، یہ ایک خبر ہے، انشاء نہیں ہے۔ یعنی ہم جس حال میں ہیں اس سے زیادہ کے مکلف بھی نہیں ہیں، اور یہ دین فطرت کا خاصہ ہے کہ انسانی بساط جتنی اور جیسی کچھ ہوتی ہے، وہ انسان اسی حالت میں اسلامی نظام سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کو جو حضرات "حقائق جدیدہ" سے "جاہل" یا ان سے "دور" رہنے کے لیے وجہ جواز بناتے ہیں۔ معاف کیجیے! وہ "ملت اسلامیہ" کے لیے کوئی قابل فخر "دریافت" نہیں پیش کر رہے بلکہ ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے اور پوری محنت سے منقح کر کے استفادہ کرنا ہے، اس کے باوجود اگر

کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ہم بری الذمہ ہیں۔ انشاء اللہ۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

سعودی عرب کا روحانی مرکز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، لیکن یہ روحانی مرکزیت اس امر کی تو متقاضی ہے کہ سعودی عرب کا فرمانروا عالمِ اسلام کا خلیفہ ہو اور یہ علاقہ دار الخلافہ قرار پائے، اور باقی عالمِ اسلام اس کے ذیلی صوبے اور انتظامی اکائیاں رہیں۔ اس سے ملی شیرازہ بندی زندہ رہے گی اور اخوت اسلامی مشہود ہو کر عالم اسلام کی طاقت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ لیکن یہ بات کہ یہ علاقہ "ماخذ شریعت" بھی قرار پائے؟ غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ائمہ دین نے اہل حرمین یا اہلِ مدینہ کے تعامل کو دینی ماخذ قرار دیا تھا، جمہور ائمہ نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ اور جن ائمہ نے ان کے تعامل پر نگاہ رکھی تھی وہ بھی صحابہ اور تابعین کے دور کی بات کرتے ہیں۔ بعد کے عہد اور دور کا ذکر نہیں کرتے۔

اختلاف مطالع کی حد کیا ہونی چاہیے؟ یہ ماہرین کے حل کرنے کا مسئلہ ہے اور وہ اس کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں، یہاں پر غلبۂ ظن کی حد تک اطمینان کی ضرورت ہے اور وہ ان علوم کے ماہرین کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ باقی رہیں اس سلسلہ کی فقہاء کرام کی احتیاطی تدابیر؟ گو وہ اپنے اخلاص اور جذبۂ خیر کی بنا پر عند اللہ انشاء اللہ ماجور ہی ہوں گے۔ تاہم وہ مصنوعات جدیدہ جن کی افادیت اور ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ثابت ہو گئی ہے، ان سے استفادہ کی راہ میں ان احتیاطی تدابیر کو اب حائل نہیں ہونے دینا چاہیے، اور نہ حائل کر کے اضحوکۂ روزگار بننے کے لیے اپنی سادہ لوحی کو نمایاں کرنا چاہیے۔

رؤیت ہلال کمیٹیاں پاکستان میں بھی بنتی ہیں مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے سامنے فارمولا کیا رہتا ہے۔ اب کے رؤیت ہلال کمیٹی کے چیئرمین کی تبدیلی سے تو اور ہی ذہنی الجھاؤ بڑھے ہیں، کیونکہ انھوں نے تنقیح معاملہ سے زیادہ اس کے نمٹانے پر سارا زور صرف کر ڈالا ہے اور بالکل یوں محسوس ہوا کہ انھوں نے یوں جلدی مچائی جیسے انھیں یہ اندیشہ ہو کہ چاند کے ہونے کی کوئی خبر نہ آ جائے ـــ بہر حال ہم شروع سے ان کمیٹیوں سے کوئی حسن ظن نہیں رکھتے اور جو مکاتیب فکر شر اٹھائے کچھ کے ذریعے اس سلسلے کی سرکاری خبروں پر چیں بجبیں رہتے تھے، وہ بھی اس سارے سفر میں "منقار زیر پر" اور دم بخود رہے ہیں۔ خدا جانے کیوں؟

۲۔ جمعہ کے دن عید

مولانا عبدالستار گوندل لاہور سے لکھتے ہیں کہ:۔

اگر عید جمعہ کے دن آجائے تو کیا عید کے بعد جمعہ کے خطبے میں بھی حاضری ضروری ہوتی ہے یا بعض کی حاضری سے کام بن جائے گا۔ (مختصراً)

الجواب

اگر جمعہ کے دن عید آجائے تو نماز عید ادا کرنے پر جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ اب جو چاہے جمعہ پڑھے جو نہ چاہے نہ پڑھے۔ جب جمعہ نہ رہا تو خطبہ میں حاضری کیسی؟

عن وھب بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال اجتمع عیدان علی عھد بن زبیر فاخر الخروج حتی تعالی النھار ثم خرج فخطب ثم نزل فصلی ولم یصل الناس الجمعۃ فذکرت ذلک ابن عباس فقال اصاب السنۃ رواہ النسائی و ابوداؤد ورجالہ رجال الصحیح۔

بعض روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ نے صرف جمعہ نہیں ترک کیا تھا بلکہ ظہر کی نماز بھی ترک کردی تھی مگر مندرجہ ذیل روایت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

عن عطا قال اجتمع عیدان فی عھد ابن الزبیر فصلی بھم العید ثم صلی بھم الجمعۃ صلوٰۃ الظھر اربعًا (مصنف ابن ابی شیبۃ)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر جب یہ لے دے ہوئی کہ انھوں نے عید تو پڑھی جمعہ نہیں پڑھا تو ابن زبیرؓ نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

فبلغ ابن الزبیر فقال شھدت العید مع عمر فصنع کما صنعت۔ (ابن ابی شیبۃ)

حضرت ابن عباسؓ نے سن کر کہا تھا، ابن زبیرؓ نے سنت پر عمل کیا ہے۔

کان ابن عباس بالطائف فلما قدم ذکرنا ذلک لہ فقال: اصاب السنۃ (ابوداؤد)

مرفوع روایات میں بھی یہی حکم ملتا ہے گو علی الانفراد ان روایات میں کلام ہے مگر مجموعی لحاظ سے قابل استدلال ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت زیدؓ بن ارقم سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا:
ہاں میں نے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ آپ نے عید پڑھ لی تھی جمعہ کی چھٹی دے دی تھی۔

سألہ معاویۃ ھل شھدت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عیدین اجتمعا؟ قال نعم صلی العید اول النھار ثم رخص فی الجمعۃ فقال من شاء ان یجمع فلیجمع (ابوداؤد)

اس میں ایاس بن ابی رملہ ہے مگر اس کے باوجود امام علی بن المدینی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، غالباً شواہد کی بنا پر۔ محلی کے حاشیہ پر ہے: والحدیث رواہ الحاکم وصححہ ھو والذھبی (محلی جلد خامس)

ایک اور روایت میں ہے، ہاں ہم جمعہ پڑھیں گے:

فمن شاء اجزأہ من الجمعۃ انا مُجَمِّعُوْنَ (ابوداؤد) وفی سندہ بقیۃ وقد صحح احمد بن حنبل والدارقطنی ارسالہ (نیل الاوطار)

حضرت علیؓ نے بھی ایک دفعہ ایسا کیا تھا اور فرمایا تھا تمہارا جمعہ بھی ہو گیا۔

عن عبد الاعلی عن ابی عبد الرحمان قال اجتمع عیدان علی عھد علی فصل بالناس ثم خطب علی راحلتہ فقال یاایھا الناس من شھد منکم العید فقد قضی جمعتہ انشاء اللہ تعالیٰ (ابن ابی شیبۃ)

حضرت عمر بن عبد العزیز کا معمول بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔

حدثت عن عمر بن عبد العزیز وعن ابی صالح الزیات ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتمع فی زمانہ یوم جمعۃ ویوم فطر فقال ان ھذا الیوم یوم قد اجتمع فیہ عیدان فمن احب فلینقلب ومن احب ان ینتظر فلینتظر (عبد الرزاق) ولکن فیہ من لم یسم۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔

قال احمد لاتجب الجمعۃ لاعلی اھل القریٰ ولا علی اھل البلد بل یسقط فرض الجمعۃ بصلوۃ العید ویصلون الظھر (عون المعبود)

• حافظ امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں ایسے موقع پر حضورؐ نے نماز عید پر اکتفا کرنے کی اجازت دی ہے

ورخص لهم اذا وقع العيد يوم الجمعة ان يجتزوا بصلوة العيد عن حضور الجمعة (زاد المعاد)

لیکن رخصت ان کے لیے ہے جنھوں نے نماز عید ادا کی ہو، دوسرے کے لیے اجازت نہیں ہے۔

والحديث دليل على ان صلوٰة الجمعة بعد صلوٰة العيد تصير رخصته يجوز فعلها وتركها، وهو خاص بمن صلى العيد دون من لم يصلها (عون المعبود)

امام ابوالحسن محمد بن عبدالهادی حنفی نزیل مدینہ منورہ متوفی ۱۱۳۹ھ فرماتے ہیں کہ حدیث سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے، ہاں حنفی مذہب اس کا مخالف ہے مگر حدیث کہتی ہے کہ جمعہ ساقط ہو جاتا ہے۔

فيه انه يجزی حضور العيد عن حضور الجمعة لكن لا يسقط به الظهر...

ومذهب علمائنا لزوم الحضور للجمعة ولا يخفى ان احاديث دالة على سقوط لزوم حضور الجمعة (حاشية السندهی على النسائی)

بالخصوص دیہاتیوں کے لیے تو حنفی بھی یہی کہتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت ان سے ساقط ہو جاتی ہے۔

وانما رخص عثمان فی الجمعة لاهل العالية لانهم ليسوا من اهل المصر وهو قول ابی حنيفة رحمه الله تعالىٰ (موطا محمد)

الغرض! عید پڑھنے کے بعد جمعہ کی چھٹی ہو جاتی ہے خاص کر دیہات والوں کو۔ ہاں پڑھ لیں تو بہتر ہے۔ (ابن ماجہ)

۳۔ مسجد کے لیے کنواں اور مال زکوٰۃ

مسجد کے کنوئیں کی صفائی کرائی گئی ہے۔ کیا مال زکوٰۃ سے اس کی اجرت ادا کی جا سکتی ہے؟ (فقیر اللہ۔ واربرٹن)

الجواب

اکثر علماء کے نزدیک اس قسم کی چیزیں قرآن حکیم کے بیان کردہ مصارف زکوٰۃ میں داخل نہیں ہیں۔ فی سبیل اللہ سے وہ صرف جہاد مراد لیتے ہیں۔ شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی نظریہ ہے۔

واما فی سبیل اللہ فقال مالک سبیل اللہ مواضع الجھاد والرباط وبه

قال ابو حنیفة۔ (بدایۃ المجتہد)

وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں "تملیک" کی صورت ناپید ہے۔

لایصرف مال الزکوٰۃ الی بناء نحو مسجد وفی الشامیة کبناء القناطر والسقایات

واصلاح الطرقات وکری الانہار والحج والجہاد وکل ما لا تملیک فیه (رد المحتار جلد ۲)

باقی رہی یہ بات کہ تملیک کی دلیل کیا ہے؟ کہتے ہیں۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین

میں لام، "لام تملیک" ہے۔ لیکن یہ بات کہ للفقراء کا لام "تملیک کے لیے ہے"؟ متفق علیہ نہیں

ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ لام استحقاق ہے، دوسری ان کی دلیل "اجماع" ہے مگر یہ بات صرف "ادعا" ہے

اس کے علاوہ لام تملیک قرار دینے سے زکوٰۃ کی افادی حیثیت اور غرض وغایت بری طرح متاثر

ہوتی ہے — خاص طور پر اس کی اجتماعی حیثیت بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ بلکہ گورنمنٹ کے لیے اس

کی وصولی بھی ناجائز قرار پا جائے گی، کیونکہ عامل، زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف تو ہے مگر

صرف بطور تنخواہ اور معاوضہ کے، اس لیے نہیں کہ وہ اپنی مالی کمزوری کی بنا پر اس کا حقدار ہے

پھر وہ وصول بحق سرکار وصول کرنے کا اختیار رکھتا ہے، بطور "ذات زید" نہیں — اس

لیے یہاں "تملیک فقہی" حقیقی نہیں رہے گی بلکہ وہ "تملیک حکمی" ہو گی اور یہ بات ہمارے منافی

نہیں ہے۔ بلکہ مفید رہے گی۔

اس کے علاوہ آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف "فی سبیل اللہ" بھی ہے۔ فی سبیل اللہ سے

مراد صرف جہاد لینا، ناحق اس کے عموم پر قدغن عائد کرتا ہے۔ صرف جہاد تو اس لیے نہیں کہ حج اور

عمرہ کو بھی حدیث میں "فی سبیل اللہ" میں شمار کیا گیا ہے اور صرف حج وعمرہ مع جہاد اس لیے نہیں کہ،

احادیث نے آیت کے عموم کے محمل سے استدلال کیا ہے، اسے محدود نہیں کیا۔ کیونکہ حدیث نے

حج اور عمرہ کو آیت "فی سبیل اللہ" کے عموم سے اخذ کیا ہے۔ اس لیے آیت کے عموم کی فقہی تخصیص بلاوجہ

ہے۔ بہرحال راقم الحروف کے نزدیک فی سبیل اللہ عام ہے اور حدیث نے اس کے عموم سے ہی "حج

اور عمرہ" کو اخذ کیا ہے۔

یہ اعتراض کہ: اگر فی سبیل اللہ اپنے عموم پر ہے تو پھر "للفقراء والمساکین" کے علیحدہ ذکر کا کیا

فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ علیحدہ ذکر سے، ان کی بالخصوص اہمیت واضح کرنا مقصود ہے — ورنہ

حضور "حج اور عمرہ" کے لیے "فی سبیل اللہ" کے عموم سے استدلال نہ کرتے۔ واللہ اعلم۔

۴۔ اذان اور قرآن میں ذکرِ رسولؐ پر درود۔ کتاب و سنت کا پیرایہ بیان

ضلع گوجرانوالہ سے جناب رشید عراقی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

۱۔ میں نے لوگوں کو اذان اور تکبیروں میں "اشھد ان محمدا رسول اللہ" کے موقع پر صلی اللہ علیہ وسلم کہتے سنا ہے۔ اشھد کے جواب میں وہی کلمہ کہا جائے یا صلی اللہ علیہ وسلم؟ علامہ گوندلوی مدظلہ العالی کا ارشاد ہے کہ جواب میں صرف وہی کلمہ کہا جائے جو مؤذن کہے، بعض کہتے ہیں چونکہ حضورؐ کے نام کے ساتھ درود شریف پڑھنے کا حکم آیا ہے لہٰذا اب صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چاہیے۔ صحیح کیا ہے؟

۲۔ کتابچہ "مولانا مودودی کے غلط نظریات مع ضمیمہ" پر آپ کا تبصرہ پڑھا جس پر حافظ صاحب کے اختلافی نوٹ بھی نظر سے گزرے۔ کیا آپ محدث کے ذریعے کتاب و سنت سے یہ وضاحت پیش فرمائیں گے جس میں کسی پیش آمدہ صورتِ حال کے لیے ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہو؟ (مختصراً)

الجواب

صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحیح یہ ہے کہ "اشھد ان محمدا رسول اللہ" کے جواب میں اشھد ان محمدا رسول اللہ ہی کہا جائے کیونکہ حضورؐ کا یہی حکم ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما یقول (رواہ مسلم)

جس حدیث میں حضورؐ کا نام سن کر درود پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اس کا یہاں اطلاق صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس مقام پر خود رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی ہے کہ ا کلمہ کے جواب میں کلمہ ہی پڑھا جائے۔ کما مر۔ اس لیے حکم عام سے یہ حکم خاص ہوگیا ہے۔ قال الشوکانی۔

انہ یقدم ما کان فیہ التصریح بالحکم علی ما لم یکن کذلک (ارشاد الفحول)

کیونکہ استنباط کا درجہ صراحت سے کم ہوتا ہے۔ حضورؐ کا نام سن کر درود پڑھنے کا حکم عام ہے، لیکن "اشھد" میں خاص ہے۔ اگر اپنے مقام پر یہ خاص حکم وارد نہ ہوتا تو پھر وہی بات رہتی جو کہی جا رہی ہے یعنی اشھد ان محمداً رسول اللہ سن کر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہم کہتے۔

رسولِ پاک کا اسمِ گرامی سن کر اور پڑھ کر درود پڑھنا ویسے بھی اپنے عموم پر نہیں رہا اور نہ اس عموم کو اسلاف نے اپنایا ہے کیونکہ کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں یہ مشروع ہی نہیں ہے۔ مثلاً خود مؤذن کو بھی "اشھد ان محمداً رسول اللہ کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم" ضرور کہنا چاہیے تھا حالانکہ یہ یہاں مشروع نہیں ہے۔ امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

الرابع انه لو وجبت الصلوٰة علیه عند ذکرہ دائما لوجب علی المؤذن ان یقول اشهد ان محمد ارسول الله صلی الله علیه وسلم وهذ الایشرع له فی الاذان فضلا ان یجب علیه (جلاء الافهام ص۳۲۹)

ہاں اذان کے بعد درود پڑھنا مشروع ہے، حضورؐ کا یہی ارشاد ہے:۔

یقول اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مایقول ثم صلوا علی (مسلم)

ہاں بعض روایات میں "جب مؤذن اذان کہے" کے الفاظ آئے ہیں کہ مؤذن اذان دے تو تم یوں کہو .... صل علی محمد الحدیث رواہ احمد وغیرہ لیکن اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے جو ضعیف ہے۔ چونکہ یہ روایت مجمل ہے، اس لیے اسے بھی محدثین نے پہلی حدیث پر محمول کیا ہے کہ اذان کے خاتمہ پر درود پڑھا جائے۔ قال السخاوی:۔

لکن یحتمل ان یکون المراد من النداء اتمامه اذا لمطلق یحمل علی الکامل ویوید ہ الحدیث الذی قبله (القول البدیع ص۱۲۱)

بات یہاں محل و موقع کی ہے، جس چیز کا جو محل اور موقع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کر دیا ہے اس سے انحراف کارِ ثواب نہیں ہو سکتا۔ ظہر کی نماز ظہر کے وقت ہی پڑھی جائے تو قبول ہوتی ہے۔ صبح کے وقت پڑھی جائے تو قبول نہیں ہو گی حالانکہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز ہی تو ہے، کسی وقت بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ مگر ایک ہوشمند ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے یوں سوچنا کہ یہ کارِ ثواب ہی تو ہے۔ پڑھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ کیونکہ یہ کام رسولِ خدا کا ہے کہ وہ بتائیں کہ یہ کارِ ثواب کس طرح اور کس موقع پر ہو سکتا ہے؟

خاص اسلوب بیان۔ مثلاً

۱۔ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (پ ۲۸ حشر ع ۱)

"جو بھی اپنی طبیعت کے بخل سے بچا لیا جائے، تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"
یہ انداز طبعی بخل کی سنگینی اور اس سے بچ جانے کی اہمیت کے لیے اختیار کیا گیا ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ اتنی سی بات نجات کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

مَنْ یَّضْمَنْ مَا بَیْنَ لِحْیَیْهِ وَ مَا بَیْنَ رِجْلَیْهِ اَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ (بخاری)

"یعنی جو شخص اس چیز کی نگہداشت کرے گا جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور جو اس کی دونوں ٹانگوں بیں ہے، میں اس کے لیے بہشت کا ضامن ہوں۔"

کیا اتنی سی بات بہشت کے لیے کافی ہے؟ یہی کہنا پڑے گا کہ یہ ان دونوں کی مضرت اور منفعت کی اہمیت اور ضرورت کے بیان کرنے کے لیے ایک اسلوب بیان ہے۔ اور سنیے!

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قَالَ: مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّیْنَ سَنَةً (مشکوٰۃ)

آپ کا کیا خیال ہے کہ: واقعی کم گوئی کا مقام اتنا ہی اونچا ہے؟

ایک شخص نے پوچھا کہ مجھے ایسا عمل بتائیں کہ بہشت مل جائے اور دوزخ ٹل جائے آپؐ نے پہلے توحید، عبادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا نسخہ بتایا۔ پھر فرمایا اس سے بھی جامع نسخہ نہ بتاؤں؟ پھر آپؐ نے روزہ، صدقہ، تہجد کا عمل بتایا۔ پھر فرمایا آپ کو، دین کی جڑ، اس کا ستون اور اس کی کوہان (اونچی چوٹی) کی راہ نہ دکھاؤں، پھر فرمایا، وہ اسلام نماز اور جہاد ہے، پھر فرمایا کہ: کیا ان سب سے بھی جامع بات نہ بتاؤں؟ پھر بتایا کہ: بس زبان کی حفاظت کر! ثُمَّ قَالَ الا اخبرك بملاك ذلك كله ..... فاخذ بلسانه وقال كُفَّ عليك (ترمذی)

کیا واقعی یہی بات ہے؟ بلکہ اس انداز بیان سے حضورؐ نے زبان کے مقام اور اہمیت کو اجاگر فرمایا ہے۔ اور یہ وہ عام روایات اور آیات ہیں، جو عموماً سامنے رہتی ہیں۔ اگر اس انداز کی آیات اور روایات کا استقصار کیا جائے تو ایک ڈھیر لگ جائے۔

۳۔ قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصدقۃ والصلوٰۃ قال تلنا بلٰی قال اصلاح ذات البین (رواہ الترمذی)

۴۔ قال موسیٰ بن عمران علیہ السلام یا رب من اعز عبادك عندك قال من

قد غفر (مشکوٰۃ)

کیا واقعی اصلاح ذات البین اور معاف کر دینے کا مقام ایسا ہی ہے جیسا الفاظ سے ظاہر ہے؟ بہر حال یہ ایک ایسا اسلوبِ بیان ہے جو ہر زبان میں مستعمل ہے۔

۵- ارذل عمر

جہلم (اقبال لائبریری) سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

۱- قرآن مجید میں ارذل عمر سے کیا مراد ہے، کتنے سال؟ چالیس سال یا کچھ اور؟

۲- کیا حضرت نوح علیہ السلام بھی اس حد کو پہنچ گئے تھے؟

۳- وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً : قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ (الاحقاف ع۲) سے بھی کیا یہی ارذل العمر مراد ہے؟

۴- کیا اسلام امیری اور غریبی کو تسلیم کرتا ہے؟ (مختصراً)

الجواب

۱- ارذل عمر:۔ اس سے مراد سال نہیں، کیفیت ہے۔ خود اسی آیت میں اس کا ذکر موجود ہے۔

لِكَيْ لَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا (پ۱۴۔ النحل ع۹۔ الحج ع۱)

کہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے۔

یعنی دماغ ساتھ دے نہ اعضاء، بس یوں سمجھیے ایک زندہ لاش، اور یہ کیفیت مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو "ستّرے بہترے" بھی کہتے ہیں۔ وہ ایک زندہ لاش ہو، جس کو جوں توں کر کے رکھا جائے۔

۲- حضرت نوح علیہ السلام اس کیفیت سے دوچار نہیں ہوئے تھے، کیونکہ نبی تھے مقتدا تھے۔ تا آخر ان کا با ہوش رہنا ایک دینی ضرورت تھی۔ بلکہ بے ہوشوں کو ہوش میں لانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا "ستّرے بہترے" جانا حکمتِ الٰہی کے منافی تھا۔

۳- چالیس سال "ارذل عمر" نہیں، پختہ اور سنجیدہ عمر کا سن ہوتا ہے۔ سورۂ احقاف کی کی اسی آیت میں اس کا ذکر موجود ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (احقاف ع۲)

یہاں تک کہ جب (آدمی) اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے یعنی چالیس برس (کی عمر) کو پہنچتا ہے۔

۴۔ امیری اور غریبی۔ معاش میں یہ فرق مراتب، معلوم اور مشہور ہے۔ اور یہ بالکل قدرتی ہے جس کا اسلام انکار نہیں کرتا (سورۂ زخرف ع ۳)

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (زخرف)

"سو اس (دنیا کی) زندگی میں تو ان کی روزی ان میں ہم تقسیم کرتے ہیں اور ہم نے (دنیوی) درجوں کے اعتبار سے ان میں ایک کو ایک پر ترجیح دی ہے تاکہ ایک دوسرے کو خدمتگار (اور تابعدار) بنائے۔"

مقصد یہ ہے کہ کام اسی فرق مراتب کے ذریعے چلتا ہے، حاجتمند دوسرے کی خدمت کر کے اپنی حاجت پوری کرتا ہے اور اہل ثروت پیسہ دے کر اپنا کام چلاتا ہے۔ اگر سارے ہی شاہزادے ہوتے تو کون کسی کو پوچھتا ہے اور سارے ہی نادار ہوتے تو کون کسی کے کام آتا۔ یہ ایک قدرتی انداز ہے جو ان ملکوں میں بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے معاشی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹ کر لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

تسلیم کرتے کے یہ معنی نہیں کہ خدا کسی کو بہ جبر غریب رکھتا ہے اور کسی کو بہ جبر امیر بناتا ہے بلکہ یہ ہے کہ: انسان اپنی استعداد اور صلاحیتوں کی وجہ سے مختلف درجات پر پہنچتے ہیں، جس کو خدا بہ جبر تبدیل نہیں کیا کرتا گویا کہ ان کی استعداد کے یہ اپنے اپنے مظاہر اور نتائج ہیں۔

ہاں اسلامی حکومت اس کی ذمہ دار ضرور ہوتی ہے کہ جو لوگ اس قدرتی اختلاف کی زد میں آ گئے ہیں وہ ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے کوئی بھی شخص بنیادی ضرورت سے محروم نہ رہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِينِ (توبہ)

صدقات فقراء اور مساکین کے لیے ہی ہیں۔ الخ

بہرحال یہ وہ امتیازات ہیں جو ہر زمانے میں قائم رہے ہیں، جنھوں نے ان قدرتی فرق مراتب کو مٹانے کے وعدے کیے ہیں، انھوں نے دراصل عوام کا استحصال کرنے کے لیے نعرے ہی ایجاد کیے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ جہاں ان مدعیوں نے اپنے جہان آباد کر رکھے ہیں، وہاں بھی سب کو یکساں روزی میسر نہیں ہے۔ ان کی رہائش، کپڑے، علاج، رسائی اور عزت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دنیا میں امیر اور غریب موجود ہیں، رہیں گے، اسلام ان واقعات کا انکار نہیں کرتا، ہاں وہ مسلمانوں اور [illegible]

نقد و نظر

جناب کریم الدین صاحب (ریٹائرڈ انجینئر) سعودی عرب

محترم مدیر رسالہ محدث کی خدمت میں ایک مراسلہ

محدث (جمادی الاولیٰ و الآخرہ ۱۳۹۷ھ) میں ناچیز نے کتاب "مولانا مودودی کے غلط نظریات" پر اپنی فہم کے مطابق جو سمجھ میں آیا، تبصرہ کیا تھا، مگر مؤلف موصوف نے ایک نئی طرح ڈالی ہے کہ اس پر تبصرہ فرما کر یہ بتایا ہے کہ، تبصرہ نگار (عزیز زبیدی) نے پوری کتاب پڑھے بغیر تبصرہ کیا ہے ــــ بہر حال موصوف کا تبصرہ قارئین کے سامنے ہے، مکرر ملاحظہ فرمالیں بہتر ہے کہ مولانا مودودی مدظلہ العالی بقید حیات ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کو مل کر یا لکھ کر اطمینان حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں! ــــ موصوف کے تبصرہ پر تبصرہ میں کوئی نئی چیز ہوتی تو کچھ عرض کی جاتی، اس لیے اب یہ بات ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

(عزیز زبیدی)

محترمی جناب مدیر صاحب زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میری کتاب "مولانا مودودی کے غلط نظریات" پر جناب عزیز زبیدی صاحب کا تبصرہ مع آپ کے قابل قدر ریمارکس کے آپ کے موقر رسالہ "محدث" بابت جمادی الاولیٰ والآخرہ ۱۳۹۷ھ میں میری نظر سے گزرا، اور جو احساسات ان کے خصوصاً اول الذکر کے متعلق احقر کے قلب میں پیدا ہوئے ان کو اس درخواست کے ساتھ جناب کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں کہ آپ ان کو براہ کرم رسالہ ہذا میں شائع فرمائیں تاکہ جن حضرات نے یہ تبصرہ اور تبصرہ پر تبصرہ تو پڑھا مگر میری کتاب نہیں پڑھی ان کی اس تبصرہ سے پیدا شدہ غلط فہمیاں اگر کوئی ہوئی ہوں وہ دور ہو جائیں اور مولانا مودودی کی تعبیر دین کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں معین ہوں۔ وھو ہذا :۔

احقر مؤلف کو ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ محترم تبصرہ نگار نے یا تو کتاب زیر تبصرہ کو سرے سے پڑھا ہی نہیں، صرف اس کے آغاز سخن سے ہی ایک اقتباس لے کر اس پر تبصرہ تحریر فرما دیا یا پھر کتاب کے مندرجات سے تجاہل عارفانہ برتا۔ ان میں سے ظن اول زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ

اگر وہ کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے کی زحمت فرماتے تو ان کو وہ متعدد دلائل بھی تفصیل کے ساتھ نظر آتے جو مودودی صاحب کی تعبیرِ دین کے رد میں سینکڑوں آیاتِ قرآنی، متعدد احادیث، سنتِ انبیاء اور عقلِ عامہ کی روشنی میں دیے گئے ہیں۔ بہرحال دونوں ہی صورتیں منصفانہ تبصرہ نگاری کی زد میں نہیں آتیں، اور حق یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے اپنی ذہنی وابستگی کے سبب (جیسا کہ مدیر محترم نے تبصرہ بر تبصرہ میں تحریر فرمایا ہے) وہ صحیح معنوں میں ایسی کتاب پر جو ان کے فکر کے خلاف ہو، تبصرہ کر بھی نہیں سکتے۔

جو کچھ وہ اس ضمن میں تحریر فرمائیں گے وہ بجائے تبصرہ کے "تردید" ہی ہوگی۔ اور یہی انھوں نے تبصرہ کے ذیل میں کیا بھی ہے۔ اور بجدا احقر کو تو اس سے بھی مسرت ہوتی اگر انھوں نے اس کے لیے کوئی معقول انداز اختیار فرمایا ہوتا۔ ان کے تبصرہ میں صرف دو چیزیں ہیں، اول تو مولانا مودودی کے نظریہ کو وقت اور حالات کے تحت ایک پیرایۂ بیان ثابت کرنے کی سعی جس کی تردید محترم مدیر نے نہایت جامع انداز میں فرما دی ہے، اور دوسری مخالفین کو مطعون کرنا۔ البتہ انھوں نے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ مولانا مودودی کے افکار کے سلسلہ میں علمی گفتگو کے لیے گنجائش باقی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ علمی گفتگو انھوں نے کس موقع کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ غریب مولف کو، جہانبانی اور مسلمانی کو غیر مرتبط سمجھنے، مولانا مودودی کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنے، ان کی عبارتوں کا حلیہ بگاڑ کر ان کو بدنام کرنے پر توجہ دینے۔ شاہ شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے مخالفین کی صف میں جا پہنچنے، اور اقامتِ دین کی تحریک پر بوجھ بننے، وغیرہ اپنے غیر ثابت مفروضات سے مطعون کرنے، کے بجائے اس کے استدلالات کا معقول علمی دلائل سے اصلاحانہ انداز میں رد فرماتے۔ اب بھی اگر وہ ایسا کریں تو احقر ان کا بے حد ممنون ہوگا اور وہ یقین مانیں کہ اگر ان کے دلائل وزنی ہوں گے تو احقر کو قبولِ حق میں ذرا پس و پیش نہ ہوگا۔ وہ ذرا ایسا کر کے دیکھیں تو۔ اب ان کے مفروضات کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو۔

۱۔ "ناقد موصوف جیسے بزرگوں کی شکایت اور اجنبیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ جہانبانی اور مسلمانی کے ارتباط پر اصرار ان کی بزرگانہ مسلمانی کے اعتبار سے دنیاداری ہے۔" اس کے متعلق عرض ہے کہ جو شخص حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضورؐ کے نبی اور بادشاہ ہونے سے واقف ہو وہ ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا اور فاضل تبصرہ نگار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ احقر مؤلف کو جس کو کسی قسم کی بزرگی کی ہوا بھی نہیں لگی، ایسے بزرگوں کے ذیل میں شمار کریں۔ جب رمضان کی راتوں میں تمتع بالازواج جو دنیوی لذات میں الذ ہے مفسدِ احترام ماہِ مبارک نہیں اور دینداری اس سے مجروح نہیں ہوتی تو جہانبانی اگر اقامتِ دین یا تمکینِ دین کے لیے ہو کیسے دنیاداری بن سکتی ہے۔

لیکن اگر اقامت دین (یعنی دین کو قائم رکھنا) یا جس کو جماعت اسلامی شہادت حق کہتی ہے، طلب جاہ اور جہانبانی ہی کے لیے ہو تو بے شک وہ دنیا داری ہے۔

۲۔ "کوتاہی یہ دراصل عام ہو گئی تھی کہ نماز روزہ جیسی مبارک عبادات پر کاربند رہ کر انسان نے اقامتِ دین اور حکومتِ صالحہ کے قیام سے اپنے آپ کو فارغ تصور کر لیا تھا۔" اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے "اقامتِ دین" کے مفہوم پر غور کر لیا جائے۔ احقر کو تو قرآن میں اس لفظ کا صرف ایک جگہ آنا معلوم ہے یعنی سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں جو مع تفسیری ترجمہ کے درج ذیل ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط

"اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو (مع ان سب کے متبعین کے) حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

مراد اس سے اصول دین ہیں جو مشترک ہیں تمام شرائع میں مثل توحید، رسالت اور بعث وغیرہ۔ اور قائم رکھنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا اور ترک مت کرنا اور تفرق یہ ہے کہ کسی بات پر ایمان لاویں اور کسی پر نہ لائیں یا کوئی ایمان لاوے کوئی نہ لاوے، حاصل یہ کہ توحید و رسالت وغیرہ دین قدیم ہے جس میں یہ تمام شرائع متفق رہی ہیں (بیان القرآن)"[۱]

ظاہر ہے کہ یہاں اقامتِ دین[۲] کا قیامِ حکومتِ الٰہیہ سے دور کا بھی تعلق نہیں اور احقر کے مطالعۂ قرآن کی حد تک یہ لفظ اس مفہوم میں قرآن میں کہیں نہیں آیا[۳] اور نہ کوئی حدیث ایسی سنی گئی جس میں حکومت الٰہیہ کے قیام کو فرض فرمایا گیا ہو اس معنی میں جیسا کہ مولانا مودودی کہتے ہیں کہ اگر روئے زمین پر صرف ایک مومن ہو اس کو بھی لازم ہے کہ اپنے ہم خیال لوگ دعوتِ حق کے ذریعہ تیار کر کے ان کا ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جد و جہد کرنے میں صرف کر دے۔ اگر فاضل تبصرہ نگار کو کوئی آیت یا حدیث اس قسم کی معلوم ہو تو براہِ کرم اس کی نشاندہی فرما دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو اقامتِ دین کو ان معنوں میں "فریضہ" کہنے کا ان کے پاس کیا جواز ہے؟

ہمارے خیال سے تو حکومتِ الٰہیہ کی جد و جہد صرف ان مسلم ممالک[۴] میں فرض ہے جہاں مسلمانوں کی غیر شرعی یا لادینی حکومتیں ہیں اور جہاں مسلمان برائے نام یا کمزور اقلیت میں ہوں وہاں ہرگز فرض نہیں ہے اور نہ دنیا کے نظامہائے کفر کو نظامہائے اسلامی سے بدلنے کے لیے اس زمانہ میں جہاد[۵]

---

[۴] کیا حسب مقدور بھی کوشش ضروری نہیں؟ [۵] اقامت دین اور اظہار دین میں اسلام کسی علاقائی تقسیم کو قبول نہیں کرتا بلکہ اسلام عالمگیر دین ہے۔ (مدیر)

فرض کفایہ ہی ہے البتہ "ولتکن منکم الخ" کے مطابق ایک تبلیغی نظام کا قیام ضروری ہے جو دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہو اور جس کے افراد اس مقصد کے لیے مخصوص طریقہ پر تربیت دیے گئے ہوں۔

حکومت بے شک تبلیغ دین میں مزاحمتوں کے انسداد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے "اُخریٰ تحبونھا" کے درجہ میں ایک مرغوب چیز ہے مگر آج کل اس کے حصول کا ذریعہ ایک مؤثر پرامن تبلیغ کے علاوہ کچھ نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تو حکم بھی ہے بلکہ اسی لیے یہ امت ظہور میں لائی گئی ہے جیسا کہ "کنتم خیر اُمّۃ" سے ظاہر ہے۔ لیکن دعوتِ دین یا تبلیغ بخطاب عام ہر شخص پر فرض نہیں ہے[له]۔ یہ تو مذکورہ بالا تبلیغی نظام کے ذمہ ہونا چاہیے، البتہ اپنے زیر اثر لوگوں کو خطاب خاص سے تبلیغ کرتے رہنا ہر شخص پر فرض ہے۔ غرض اس طرح مؤثر تبلیغ سے خدا کو منظور ہوا[ك] تو لوگوں کے اذہان بدلیں گے اور بلا قتال بھی حکومت الٰہیہ قائم ہونا ممکن ہوگا۔ ہاں اگر تبلیغ میں مزاحمت کا قوی احتمال ہو تو جہاں اس کے شرائط پائے جائیں وہاں قتال بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ مسلمان فریضۂ تبلیغ سے قطعی غافل ہو گئے ہوں۔ کچھ نہ کچھ کام زبان و قلم، نقل و حرکت سے اب بھی ہو رہا ہے اور گو وہ ناکافی ہو مگر آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اقامتِ دین اور حکومتِ صالحہ کے قیام سے مسلمانوں نے اپنے کو فارغ تصور کر لیا تھا جس کا ذریعہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا سوائے تبلیغ کے اور کچھ نہیں۔

۳۔ اس مرحلہ پر مولانا (مودودی) نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی دینداری اگر اقامتِ دین کے فریضہ سے غافل ہو چکی ہے تو پھر وہ عبادت کیا اور وہ نماز کیسی؟ ..... عبادت سچی غلامی کا نام ہے۔ وہ غلام ہی کیا جو آقا کے حضور مؤدّب کھڑا ہو جائے مگر آقا کی مرضی اور خوشی کی پرواہ نہ کرے۔ اور ان تمام مناظر کو دیکھ کر چپ رہے جو آقا کو قطعاً پسند نہیں۔

ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ اقامتِ دین بمعنی قیامِ حکومتِ الٰہیہ صرف غیر شرعی مسلم حکومتوں میں آباد مسلمانوں ہی پر فرض ہے جس کا طریقہ صرف مؤثر اور پُرامن تبلیغ ہی ہے جو فرض کفایہ ہے البتہ خود اپنی اصلاح اور اپنے زیر اثر لوگوں کی اصلاح کی کوشش انفراداً بھی فرض ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے غافل نہیں ہے اور ذکر اللہ کے لیے حضورِ قلب سے نماز پڑھتا ہے اس کی نماز واقعی نماز ہے۔ اس زہریلے مفروضہ میں مولانا مودودی نے صلحاء امت سے عوام کو بدظن کرنے کی سعی نامشکور فرمائی ہے۔ بلکہ انھوں نے تو اقامتِ دین میں اپنے معیار کے موافق حصہ نہ لینے والے صلحاء و اتقیاء کے ایمان ہی کو مشتبہ سمجھا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص تبلیغ میں قطعی حصہ نہ لے

[له] الا علم و داع و کلام مشغول عن دعوتہ ۱۲ زبیدی [ك] اگر اجتماعی طور [illegible] ۱۲ زبیدی

مگر نماز خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھتا ہو، اس کی نماز کو عبادت سے خارج کرنا دین میں تنگی پیدا کرنا ہے حالانکہ اَلدِّینُ یُسْرٌ۔ بلکہ میں مزید ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دیگر مذہبی احکام میں کوتاہی کے ساتھ بھی مومن کی نماز جو حضورِ قلب سے پڑھی گئی ہو ہرگز ثواب سے خالی نہیں۔ آقا کے رحم و انصاف سے بہت بعید ہے کہ وہ دوسری بداعمالیوں کی وجہ سے اچھی پڑھی ہوئی نماز کا ثواب بھی نہ دے۔ اب ذرا تبلیغ جو فرض ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی سن لیجیے۔ آیت ۱۰۵ سورۂ مائدہ میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْؕ۔ اے ایمان والو اپنی فکر کرو (اصل کام تمہارے ذمہ یہ ہے باقی دوسروں کی اصلاح کے متعلق یہ ہے کہ) جب تم (اپنی طرف سے بتوقع نفع بقدر وسع سعی کر رہے ہو تو تم دین کی) راہ پر چل رہے ہو۔ تو جو شخص (تمہاری سعی و اصلاح کے باوجود) گمراہ رہے تو اس (کے گمراہ رہنے) سے تمہارا کوئی نقصان نہیں (مطلب یہ کہ عدم ضرر مشروط بالہتدا ہے جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر داخل ہے۔ البتہ جلالین میں حاکم کی روایت سے حدیث ہے کہ تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو حتّٰی کہ جب حرص و خود رائی وغیرہ کو غلبہ ہو جاوے اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنے شغلِ اصلاح میں لگ جاؤ۔ (بیان القرآن)

اس کے علاوہ مشہور حدیث ہے جس میں کسی منکر کو کم از کم دل سے برا سمجھنے والا بھی مومن ہے بکثرت لوگ ایسے ہی مومن ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی عبادت کو عبادت نہ سمجھنے کا جب کہ وہ اپنی اصلاح سے غافل نہ ہوں، کسی کو کیا حق ہے؟

ہم ۔ "آپ کی عبادات کو اس قابل ہونا چاہیے تھا کہ آپ اقامتِ دین کر سکتے، کتاب و سنت کا سکہ جاری ہوتا اور ایک ایسی حکومتِ صالحہ وجود میں آجاتی جو ملکی فضاؤں کو مسلمان رکھ سکتی" اس کے متعلق عرض ہے کہ عبادات کو قیامِ حکومتِ الٰہیہ کا ذریعہ سمجھنا ان ہی حضرات سے ممکن ہے جو ان کو جہاد کا ٹریننگ کورس سمجھتے ہوں۔ ہم تو حکومت کو ایک عطیۂ الٰہی[1] سمجھتے ہیں جو کمالِ ثبات فی الدین پر آیت ۴۱ سورۂ حج میں موعود ہے۔ اس میں بھی معقول جنگی طاقت کی فراہمی اور قتال مقدر ہے۔ یہ نہیں کہ محض عبادات کے ذریعہ حکومت مل جائے گی۔ پھر یہ وعدہ بھی قضیۂ دائمہ کے طور پر نہیں ہے کہ ہمیشہ اس کا ظہور ضروری ہو۔ البتہ جن حالات میں یہ وعدہ کیا گیا تھا ویسے ہی حالات واقع ہوں تو اب بھی اس کا ظہور متوقع ہے۔ یہی خیال ہمارا آیت اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ[2]

[1] اس آیت کی تفسیر حضرت ابوبکرؓ سے پوچھیے۔ ۱۲۔ زبیدی۔ [2] فرد کا ایمان اور حکومت کا اسلام دونوں ہی عطیہ الٰہی ہیں۔ اگر تبلیغ سے ..... فرد کی اصلاح فرض ہے تو فلاحی حکومت کا قیام بھی دعوتِ عامہ سے جملہ افرادِ امت کا اہم تر فریضہ ہے (ایڈیٹر)

کے متعلق ہے اسی لیے احقر حضرت مجذوبؒ کے اس شعر کو صحیح نہیں سمجھتا ؎

وعدۂ غلبہ ہے مومن کے لیے قرآن میں
پھر جو تو غالب نہیں کچھ ہے کسر ایمان میں

۵۔ "مولانا مودودی کے سلسلہ میں سب سے بڑی زیادتی یہ روا رکھی جا رہی ہے کہ ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش تو نہیں کی جاتی لیکن ان کی عبارتوں کا حلیہ بگاڑ کر ان کو بدنام کرنے پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے ...... جو لوگ ان کی مساعی جمیلہ پر کسی بھی درجہ سے اثر انداز ہوتے ہیں وہ ہزار نیک نیتی کے باوجود وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں شاہ شہید اور سید احمد شہید کے نیک نیت مخالفین پہنچے تھے۔" اس قطعی بے بنیاد الزام کے متعلق عرض ہے کہ احقر نے مولانا کا لٹریچر خالی الذہن ہو کر پڑھا۔ جماعت اسلامی والوں سے گہرے روابط رکھے۔ ان سے افہام و تفہیم کی کوشش کی۔ جب شرح صدر نہ ہوا تو یہ کتابچہ لکھ کر پہلے مولانا مودودی کی خدمت میں بھیجا کہ یا تو اس کو مان کر اپنے خیالات سے رجوع فرمالیں یا پھر میری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں۔ انھوں نے رسالہ واپس کر دیا اور مجھے لکھا کہ آئندہ اس معاملے میں انھیں کچھ نہ لکھوں اور کچھ نہ بھیجوں۔ تب اس کو چھپوایا۔ اب آپ فرمائیں کہ سمجھنے کی اس سے زیادہ کیا کوشش ممکن ہے؟

رہا ان کی عبارتوں کا حلیہ بگاڑ کر انھیں بدنام کرنے پر توجہ دینا تو آپ کی اس بے بنیاد اور بے جا بدگمانی کے متعلق عرض ہے کہ احقر نے اپنے کتابچہ میں ان کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں اگر ان میں آپ کسی جہت سے بھی کہیں حلیہ بگاڑنا ثابت کر دیں تو احقر اپنی بساط کے موافق جناب کی خدمت میں کچھ انعام بھی پیش کرے گا۔ ورنہ آپ کو سوءِ ظنی سے جو بعض اوقات گناہ ہوتی ہے احتراز کرنا چاہیے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے ایسا کیا ہو مگر آپ کو سب کو ایک ڈنڈے سے ہانکنے کا کوئی حق نہیں۔ احقر تو مولانا مودودی کا کافی حد تک مداح ہے اور اپنے ہم مشربوں میں ان کا دفاع بھی کرتا رہتا ہے اور جب سے ان کو بیمار سنا ہے یعنی کئی سال سے نمازِ فجر کے بعد ان کی صحت کی دعا بھی کرتا رہتا ہے لیکن اس سب کے باوجود ان کی غلط تعبیر دین پر ایمان تو نہیں لایا جا سکتا۔ اور شاہ شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کی مثال دینا غلط ہے۔ انھوں نے قیام حکومتِ الٰہیہ کی عملی کوشش کی تھی مگر دین کی تعبیر تو نہیں بدلی۔ ان کے مخالفین میں احقر ہرگز شامل نہیں ہے۔

آخر میں صرف محترم مدیر رسالہ "محدث" کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ نے جو تبصرہ بر تبصرہ میں احقر کا جو دفاع فرمایا ہے اس کے لیے احقر بے حد ممنون ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں خود ایسے

[illegible]

ا؎ شکریہ از زبیدی

مدلل اور جامع طریقہ پر اپنا دفاع نہ کر سکتا۔ البتہ دو چیزیں قابل عرض کہنے کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ناقد موصوف کا کئی جگہ اپنے اکابر کے فکر کو بطورِ معیار پیش کرنا بھی کھٹکتا ہے۔" میں نے تو صرف جہاد کے سلسلے میں ایک جگہ حضرت تھانویؒ کا ملفوظ نقل کیا ہے اور حق یہ ہے کہ اگر مجھے یہ ملفوظ نہ ملتا تو میرا یہ اشکال کہ مسلمانوں نے ایران و شام وغیرہ پر کیوں حملہ کیا برسوں سے دل میں کھٹکتا تھا۔ مولانا مودودی کی "الجہاد فی الاسلام" اور متعدد علماء سے پوچھ تاچھ سے بھی حل نہ ہوا تھا، اس ملفوظ سے حل ہوا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ سورۂ ماعون کی تفسیر میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ان نمازیوں کے لیے بھی ویل ہے جو حسن معاملت میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یہ صحیح نہیں، "ویل" تو "ساھون"[1] ہونے کی علت سے ہے باقی اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے صفات مزید بیان فرمائے ہیں اور سورت کا یہ ٹکڑا منافقین کے حق میں ہے۔ فقط والسلام۔

---

[1] اگلے الفاظ جن میں ماعون کا ذکر ہے وہ اسی آیت ساھون کی تفسیر و بیان ہے نہ کہ اضافی چیز۔ نیز غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے فی صلوتھم ساھون کی بجائے عن صلوتھم ساھون کے الفاظ فرمائے ہیں جن سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ کچھ صفات کے حامل لوگ نماز پڑھنے کے باوجود نماز سے دور ہی رہتے ہیں یعنی عبادات میں ریا اور معاملات میں کوتاہی نماز پڑھنے والوں کے لیے ویل کا سبب ہے۔ گویا جو نماز ایسی مکمل زندگی سے بار آور نہ ہوتی وہ سہو کی نماز ہے خواہ وہ اہتمام سے ہی ادا کی گئی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے محترم زبیدی صاحب کے تبصرہ پر جس تعلیق کی ضرورت محسوس کی تھی، مؤلف موصوف کے خلافت علی منہاج النبوۃ (حاکمیت رب العالمین) کے بارے میں اس تنقیدی مراسلہ کے بعد محترم مؤلف کے غیر مربوط فکر کی ایک دوسری انتہا بلکہ ناقص تر تصورِ دین کی طرف اشارہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جناب مؤلف کو کتاب و سنت کے ایک نہایت اہم موضوع پر سارے قرآن اور ذخیرہ احادیث میں کوئی چیز نہ مل سکی ہے۔ حالانکہ اقامتِ دین کی تکمیل خلافتِ اسلامیہ پر جا کر ہی ہوتی ہے۔ اور کتاب و سنت میں نہ صرف اس کا اجمالی ذکر بلکہ تفصیلات تک بھری پڑی ہیں۔ فی الحال اگر مؤلف اخلاص کے مدعی ہیں تو وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال: ۳۹) اور اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (بخاری مسلم) ایک آیت اور ایک حدیث ہی غور فرما لیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ دعوتِ دین کی حد تک تو قرآن کا حکم وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ الآیۃ ۳/۱۰۴ ہے فرض کفایہ ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۳/۱۱۰) جس میں پہلا درجہ مَنْ رَّاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ کی رو سے حکیمانہ طاقت کا ہے۔ دراصل مؤلف کا یہ تصور ٹھیک تھا کہ دین کا کوئی شعبہ دوسرے کا مقصودِ حقیقی نہ ہے لہٰذا میں نے اس کی تائید کی تھی لیکن یہ کہنا کہ ان شعبوں کا آپس میں ارتباط نہ ہے جس سے کوئی مکمل نظام تشکیل پاتا ہو اور اس اعتبار سے کسی میں کوتاہی دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہو، بالکل غلط ہے سفاہم و تدبر! (ادارہ)

محمد اسمٰعیل ذبیح

داڑھی۔ اِمام۔ مُلّا

ان دنوں مخصوص نظریات کے حامل بعض بڑے اور چھوٹے اور مرد اور عورتیں سب ہی بطورِ خاص داڑھی، امام اور ملّا کو اپنا نشانہ بنا رہے ہیں اور چونکہ ان میں ایک سابق سرکاری "مولانا" کے سوا کسی کی داڑھی نہیں ہے اور فریقِ مقابل میں زیادہ لوگ اور ان کے حامی داڑھی والے ہیں اس لیے گویا سیاسی جنگ داڑھی والے اماموں اور ملّاؤں اور بغیر داڑھی والے مسٹر سیاستدانوں کے درمیان ہے اور چونکہ ان مہم بازوں کا مفروضہ یہ ہے کہ حکومت چلانے کے فن اور علم سیاست اور معیشت سے داڑھی والے ملّا نابلد ہیں اس لیے بغیر داڑھی والے ہی اس کو چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ چونکہ اس طرح کی گھٹیا اور جاہلانہ بات اب مرکزی پروپیگنڈہ مہم بن گئی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان مسلمان عوام کو جو سادگی کی بنا پر داڑھی، امام اور ملّا کی تاریخی عظمت سے ناآشنا ہیں اور جن کو اپنی تاریخ بلکہ پوری انسانیت کی الہامی، روحانی، علمی اور فضل و کمال کی رفعتوں کا پتہ نہیں ہے۔ مختصراً یہ تبلا دیا جائے کہ جہالت کی کیچڑ اچھالنے والے جو اہانت اور تذلیل داڑھی، امام اور ملّا کی کر رہے ہیں وہ اسلام کے ساتھ بدترین مذاق اور مذہب سے ناواقفیت ہے اور دنیا کے عظیم رجال کے سوانح حیات سے بے خبری ہے۔ یہ عظیم مسلم ثقافت کو برباد کرنے کی ایک شرمناک حرکت ہے جو کوئی قوم جس کا تاریخی تشخص تاریخ عالم پر ثبت ہو ہرگز نہیں کر سکتی۔

اب میں سلسلہ وار اختصار سے داڑھی، امام اور ملّا کی حیثیت تاریخ عالم کے آئینے میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار رسول اور نبی اس زمین پر ہدایت کے لیے تشریف لائے۔ ان میں سے سب کی پُر نور داڑھی تھی۔ اور احادیث میں تو حضور ختمی مرتبت کی مبارک داڑھی کی پوری تفصیلات تک بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح ثابت ہوا کہ داڑھی انبیائے کرام کی صفاتِ صوری کا ایک لازمی حصّہ رہا ہے اور وہ کائنات کی سب سے مقدس شکلوں کا نورانی ہالہ ہے۔ پھر جو بھی شخص امتِ محمدیہ میں حضورِ اکرم

کے اتباع میں داڑھی رکھتا ہے وہ داڑھی نہ رکھنے والے مسلمان سے لازماً افضل اور بہتر ہے۔

۲۔ حضورِ ختمی مرتبت صلعم کی پُر انوار داڑھی کی پیروی تمام خلفائے راشدین، تمام صحابہ کرام تمام تابعین اور تمام تبع تابعین نے فرمائی۔ ان میں ہر ایک کی داڑھی تھی حتیٰ کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور بنی فاطمہ کے سلاطین یا خلفاء میں اِلّا کسی استثناء کے سب کی داڑھیاں تھیں۔

۳۔ مذہبی علم و فضل کے تمام رجال اکبر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور فقہ جعفریہ کے بانی امام جعفر صادق اور ان کے کروڑوں متبعین میں غالب اکثریت موجودہ مغربی تہذیب کی یلغار سے پہلے تک داڑھی کو نشانِ اسلام سمجھتی رہی ہے۔

۴۔ نہ صرف عظیم محدث، فقیہ، مفسر اور علومِ اسلامیہ کے امامانِ وقت بلکہ تمام عظیم مسلم فاتحین اور جرنیل جن کی تصویریں، تاریخی حلیے کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں داڑھی کا حسن ان سب کی صورتوں میں نمایاں ہے۔ عربوں کی طرح بربر، ترک، مغل اور مختلف نسلوں کے مسلمان سلاطین جو دنیا کے مختلف براعظموں پر حکومت کرتے رہے معمولی استثناء کے ساتھ سب کے سب داڑھی کے حسن سے مالا مال تھے۔ برصغیر کی ہزار سالہ مسلم دورِ اقتدار کی تاریخ میں اکبر و جہانگیر اور اس کے بعض زوال آلودہ جانشینوں کو چھوڑ کر اسلامی حس و ذوق و شوق رکھنے والے بابر، شاہجہان، اورنگ زیب اور بہادر شاہ ظفر کے چہرے داڑھی کے حسن سے آراستہ تھے۔ مغلوں سے پہلے کے تمام سلاطین غزنی، تغلق خلجی وغیرہ داڑھی والے پُر جلال بادشاہ تھے۔

۵۔ برطانوی دورِ استعمار کے آغاز کے ساتھ ہی اگرچہ "بے ریش" چہروں کی مسلم معاشرت میں کثرت ہونے لگی لیکن پھر بھی سیاست و قیادت کا جھنڈا داڑھی والے اکابر کے ہاتھ میں رہا۔ وہ جمال الدین افغانی ہوں یا محمد عبدہٗ مصری یا عبدالوہاب نجدی یا برصغیر میں مسلم قومیت کی عظمت کے بانی سرسید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ مغربی علوم کے تعلیم یافتہ اکابر ہوں ان کی شرعی داڑھیاں عظمتِ اسلام کا سکہ قائم کرنے میں انقلابی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔

۶۔ داڑھی مسلم معاشرے میں امتیازی اسلامی انفرادیت کا اظہار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں علماء اور طلباء داڑھی کو لازمی صفاتِ مسلم سمجھتے ہیں لیکن صرف برصغیر کی حد تک بھی داڑھی، مفکرین، ماہرین السنہ، سائنس اور دیگر علوم نو کے مستند مسلمان اساتذہ میں نمایاں رہی ہے۔ پاکستان کی موجودہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک پروفیسروں میں داڑھی والے

نمایاں قدر و منزلت کے مالک ملیں گے وہ بابائے اردو مولوی عبد الحق ہوں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عظیم خادم ڈاکٹر ضیاء الدین ہوں یا بھارت کے پہلے مسلم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ہوں داڑھیاں سب کی شخصیت کا مشترکہ اظہار رہیں۔

۷۔ مسلم امتیاز سے ہٹ کر بھی داڑھی کو عالم انسانیت میں ہمیشہ سب سے بلند درجہ احترام حاصل ہے ۔ یونان کے جملہ فلاسفر اور حکماء داڑھی والی شکلوں کے مالک تھے ۔ عہد قدیم سے عہد جدید تک یورپ کے اکثر فاتحین و سلاطین بھی داڑھی والے تھے، زارِ روس، قیصرِ جرمن اور شہنشاہ برطانیہ بھی اسی طرح داڑھیاں رکھتے تھے جیسے کمال اتاترک دَور سے پہلے سلطنت عثمانیہ کے تمام سلاطین رکھتے تھے۔

۸۔ مذہبی لحاظ سے بھی مسلم و غیر مسلم اعمال میں داڑھی کی اہمیت مسلّم رہی ہے ۔ یہودیوں کے ربّی۔ عیسائیوں کے پادری، ہندوؤں کے سنیاسی، سکھوں کے گرو سب داڑھی کی عظمت کو اپنا تہذیبی نشان سمجھتے رہے ہیں اور ثقافتی طور پر برصغیر میں راجپوت بھی داڑھی کو اپنی آن بان کا مظہر سمجھتے رہے ہیں۔ جیسے اسلامی اور قبائلی دونوں لحاظ سے پاکستان کے بلوچ اور پٹھان قبائل سمجھتے ہیں۔

صرف مسلمان نہیں بلکہ آج بھی یورپ کے بہت سے نامور سائنس دان اور اہل علم و فضل داڑھیاں رکھتے آئے ہیں۔ بھارت میں نوبل پرائز یافتہ شاعر ٹیگور، بڑے فلسفی بھگوان داس بڑے سیاست دان اور برطانوی دور کی انڈین پارلیمنٹ کے مشہور صدر وٹھل بھائی پٹیل اور انڈین نیشنل کانگرس کے ایک سابق صدر پرشوتم داس ٹنڈن جیسوں کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں۔

۹۔ داڑھی کی عظمت کے سلسلے میں "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کی نعرہ باز پارٹی کے لیے یہ آخری مثال بطور برہان قاطع پیش کرتا ہوں کہ اس صدی کا سب سے بڑا انقلابی مفکر کارل مارکس اینگلز اور اس کے فلسفہ سوشلزم کا پہلا عملی معمار لینن اور امریکی سامراج کو تاریخی شکست دینے والا ہوچی منہ داڑھیوں والے "مردانِ انقلاب" تھے۔

تاریخ کے اس آئینہ میں جس حیثیت سے بھی دیکھیے داڑھی انسانیت کے اس بلند مقام پر فائز ہے جہاں وہ انسانیت کی روحانی اور مادی دونوں معراجوں کو چھو لیتی ہے ۔ اب داڑھی دشمن پارٹی والے خود ہی سوچیں کہ وہ داڑھی کی تذلیل کر کے اپنے آپ کو کتنی نیچی سطح پر گرا رہے ہیں اور وہ اس داڑھی کے کھیل میں کیسی ذلیل شکست کھا چکے ہیں۔

امام کا مقام رفیع، جو پارٹی یہ کہہ کر امام کی توہین کرتی ہے کہ وہ ایک غریب ہے اور دیہات

اور شہروں کی مسجدوں میں ان کی روٹیوں پر پلتا ہے وہ خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہے

شیعوں کے نزدیک تو امام کا مقام تو نبی اکرم کی جانشینی کا درجہ رکھتا ہے لیکن غیر شیعہ مسلمان جو تمام دنیا میں غالب تر ہیں چاروں فقہی مسلک کے اماموں میں سے کسی کے پیروکار ہیں جہاں کہیں بھی کسی فقیہ کا تصور ہے وہیں امام موجود ہے۔

مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے ان رجالِ اکبر کو جو فقہ، حدیث، تفسیر، یا علمِ کلام یا شریعت اسلامی کی گہری تشریح سے وابستہ ہیں ان کو امام کا درجہ دیا ہے جیسے امام بخاری، امام مسلم، ائمہ اربعہ، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور امام فخر الدین رازی وغیرہ ہیں بلکہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے یگانۂ عصر اسلامی علوم کے ماہروں کو بھی امام کا درجہ حاصل ہے۔

امام کا اعزاز، ملا، مولوی، مولانا ان سب سے افضل ترین ہے جن کو بھی اسلامی تاریخ میں امام کہا گیا ہے وہ تاریخ اسلامی و انسانی کی عظیم ترین شخصیتیں رہی ہیں۔

امام کی عظمت سے بے خبر ہو کر اس مقدس لفظ کی توہین شعائرِ اسلامی کے ساتھ وہ گستاخی ہے جو مسلمان ارکان پر مشتمل کوئی جماعت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک وہ ظلمت اور جہل پر مرکب کا مجموعہ نہ ہو۔

ملا کی تاریخی فضیلت

بعض لوگوں کی طرف سے اسلامی شعائر کی اہانت کی مہم میں سب سے زیادہ ملاؤں کو رگڑا جا رہا ہے۔ گویا مخالف کو ملا کہہ دینا عوام میں اس کو بے وقعت بنا دینے کے لیے کافی ہے لیکن اگر تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو ملا کا مقام علامہ، مولانا اور مولوی سے بھی بلند ہے۔ فضیلت کی ترتیب کے لحاظ سے امام کے بعد پہلا درجہ ملا کا ہے پھر مولوی کا پھر علامہ کا اور پھر مولانا کا آتا ہے۔ ملا ایک آفاقی خطاب ہے جو ان عالمانِ دین کو دیا گیا ہے جو لاثانی علمی حیثیت کے مالک تھے۔ برصغیر میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا نظام الدین بانی سلسلہ درس نظامی، ملا جیون اور ملا محب اللہ بہاری جیسے افراد نابغۂ روزگار تھے۔ تاریخ میں اور بہت سے جینئس علماء کو ملا کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ مغربی تہذیب کے عروج کے بعد ملا کا اعزاز برتر علماء کے لیے کم ہو گیا اور مسجدوں سے وابستہ غریب افراد کو ملا کہا جانے لگا اسی طرح مولوی کی اصل حیثیت کو کم تر کر دیا گیا حالانکہ نابغۂ عالم رومی مولوی ہی کہلاتے ہیں جیسا کہ اس فارسی شعر میں کہا گیا ہے۔ مثنوی مولوی

ہست قرآں در زبان پہلوی

جب مسلم تہذیب کا شباب تھا تو اعلیٰ ارکینِ علم کو قاضی کے ساتھ مولوی بھی کہا جاتا تھا۔ جس کی باقیات اب بھی مولوی عبدالحق، مولوی جسٹس مشتاق حسین اور مولوی محمد شفیع وغیرہ میں ملتی ہیں اور جس کی ایک روشن مثال ملا واحدی مرحوم تھے۔ ملّا کے مقام کی بلندی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بمبئی کے پارسی قانون داں جسٹس نے اسلامی فقہ پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ سند کا آخری مقام رکھتی ہیں اور کسی وکیل اور کسی ایڈووکیٹ کی لائبریری فقہ اسلامی پر ان کی تصانیف سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لکھنؤ ہائی کورٹ کے مشہور جج آنند نرائن بھی ملّا کے نام سے مشہور ہیں ان کی قانونی رولنگ اور ان کی اعلیٰ صوفیانہ اردو شاعری کو سند کا درجہ حاصل ہے۔

لکھنؤ کے جسٹس آنند نرائن ملا صرف نام کے نہیں بلکہ اپنی ذات کے بھی ملا ہیں۔ وہ ہندو کشمیریوں کی اس گوت سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ملا کی عظمت دیکھ کر کشمیر کی مسلم حکمرانی کے زمانے میں ملّا کو اپنی ذات بنا لیا تھا کیونکہ یہ عربی، فارسی کے علوم میں دستگاہ رکھنا اپنا امتیازی قومی نشان سمجھتے تھے۔

ملّا اور مولوی کی اصل فوقیت کو چھوڑ کر آج کل کے علماء نے اگر "مولانا" کہلانے میں زیادہ فخر محسوس کیا ہے تو یہ محض ذمہ داری سے فرار ہے۔ ملّا اور مولوی میں امتیازی علمیت کے ساتھ دین پر عمل اور روحانیت کا وجود بھی لازمی رہا ہے مگر اب اگرچہ بہت سے حقیقی علماء واقعۃً مولانا ہیں اور وہ کردار میں اسلامی راہ پر عامل ہیں اور ان میں ملّا اور مولوی کی صفات بھی پائی جاتی ہیں مگر مولانا کے پردے میں بہت سی کالی بھیڑیں بھی کھپ جاتی ہیں جیسے خود یہ راقم الحروف ہے جو علم میں بے مایہ اور عمل میں سیاہ ہے۔ اس طرح پیپلز پارٹی کا ایک وہ واحد "مولانا" بھی ہے جو امام، ملّا اور مولوی کی حقیقی عظمت کو جانتے ہوئے بھی کچھ افراد سے سیاسی محاذ آرائی کرتا ہوا عظیم اسلامی خطابات امام اور ملّا کی مسلسل تذلیل کر رہا ہے اور جو نصرت بھٹو کے سر خ دوپٹے کو چادرِ حضرت زینبؓ کہہ بیٹھا ہے۔ ع

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است!!

خلاصۂ کلام

میرے اس مضمون کا منشا سیاسی معنوں میں ایک پارٹی کی حمایت اور دوسری کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔ میں بڑی دلسوزی اور دردمندی سے اس ضابطۂ اخلاق کی طرف مسٹر بھٹو کی پارٹی کے پروپیگنڈا بازوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔۔۔ جو اگرچہ ان کے "موجودہ" ضابطۂ اخلاق انتخابی مہم"

میں تحریر نہیں ہے مگر اسلامی تاریخ، اسلامی ثقافت اور شعائر اسلامی کے عظیم تر ضابطے کی لوح محفوظ میں موجود ہے۔ خدارا اس عارضی جنگ اقتدار میں مستقل اسلامی اقدار کی عمارت منہدم نہ کریں اور بازی بازی با ریش بابا ہم بازی" کا سفلانہ طریقہ اختیار نہ کریں۔ رہا یہ مسئلہ کہ قومی اتحاد کے مولانا مودودی، شاہ احمد نورانی، مفتی محمود، پروفیسر عبدالغفور، مولانا عبدالستار نیازی، پروفیسر محمد اعظم، ڈاکٹر اشتیاق حسین، مولانا عبدالحق سرحدی، پروفیسر شاہ فرید الحق وغیرہ محض داڑھیاں رکھنے کی وجہ سے اپنے مذہبی اور مغربی علوم میں امتیازی فضیلت حاصل کرنے کے باوجود ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے نااہل ہیں تو کیا وہ کابینہ جو مسٹر بھٹو نے اپنے بے ریش افراد کی بنائی تھی ان سے زیادہ قابل تھی؟

اوکے نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں (ماخوذ)

تاریخ و سِیَر

جناب طالب ہاشمی

حضرت زبیرؓ بن العوام ــــ حواریٔ رسولؐ

بعثت کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن مکہ میں ایک وحشت اثر خبر پھیل گئی۔ اس منحوس خبر نے پرستارانِ حق کو سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ابھی ابو طالب زندہ ہیں اور بنو ہاشم کی تلواریں کند نہیں ہو گئیں ــــ یہ خبر صحیح تھی یا محض افواہ تھی، اس کے بارے میں کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین نے گرفتار کر لیا ہے اور کچھ کا کہنا تھا کہ حضورؐ شہید کر دیے گئے ہیں۔ بنو ہاشم سخت غیظ و غضب کے عالم میں تھے، وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ بنو اسد کے ایک نوعمر لڑکے کے کانوں میں بھی اس خبر کی بھنک پڑ گئی۔ سولہ سال کی عمر کے اس کشیدہ قامت اور قوی الجثہ نوجوان کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے قیلولہ کرنے اپنے گھر آیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی تڑپ کر اٹھ بیٹھا، کھونٹی سے تلوار اتار کر اس کا نیام زمین پر پٹک دیا اور شمشیر بکف مکہ کی گلیوں میں کود گیا۔ اس کا رخ مکہ کے بالائی حصے میں واقع سرورِ عالمؐ کے کاشانۂ اقدس کی جانب تھا۔ اس وقت جوشِ غضب سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ نہایت تیزی سے گلیاں طے کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ حضورؐ کے کاشانۂ مبارک پر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی کہ مہبطِ وحی و رسالت خیر و عافیت کے ساتھ وہاں رونق افروز ہیں۔ حضورؐ شمشیر بکف نوجوان کو دیکھ کر متبسم ہو گئے اور فرمایا "کیوں بھائی خیر تو ہے اس وقت تم شمشیر برہنہ سونت کر کیسے آرہے ہو؟"

نوجوان نے عرض کیا: یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا ہے یا شاید آپ شہید کر دیے گئے ہیں۔

ارشاد ہوا: اچھا تو یہ بات ہے اور اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟

نوجوان نے بے ساختہ عرض کیا: "یا رسول اللہ خدا کی قسم میں اہلِ مکہ سے لڑ مرتا" اس

کا جواب سن کر رحمتِ عالم کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی۔ آپؐ نے اس جوان کے جذبۂ فدویت کی تحسین فرمائی اور اس کے حق میں دعائے خیر کی بلکہ اس کی تلوار کو بھی دعا دی کہ یہ پہلی تلوار تھی جو راہِ حق اور رسولِ برحق کی حمایت میں بلند ہوئی۔ رسول اللہ کے عاشقِ صادق یہ نوجوان بنو اسد کے گل سرسبد سیدنا حضرت زبیرؓ بن العوام تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابو عبداللہ زبیر بن العوام (بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی) تاریخ اسلام کی ایک اہم باشان شخصیت ہیں۔ ان کو بارگاہِ نبوت سے "حواری رسول" کا لقب عطا ہوا۔ اور سرورِ کائنات نے اپنی زبانِ مبارک سے انھیں جنت کی بشارت دی۔ اس طرح وہ اصحاب عشرۂ مبشرہ میں شمار ہوئے۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا عمر فاروقؓ انھیں ارکانِ دین میں سے ایک رکن قرار دیا کرتے تھے (اصابہ۔ ابنِ حجرؒ) حضرت زبیرؓ کو ذاتِ رسالت مآب سے کئی نسبتیں حاصل تھیں۔

۱۔ وہ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب کے فرزند تھے اس طرح حضورؐ ان کے ماموں زاد بھائی تھے۔

۲۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ حضرت زبیرؓ کی پھوپھی تھیں۔ اس لحاظ سے سرورِ عالمؐ حضرت زبیرؓ کے پھوپھا تھے۔

۳۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ حضرت زبیرؓ سے بیاہی گئی تھیں۔ اس نسبت سے وہ سرورِ کائنات کے ہم زلف تھے۔

۴۔ حضرت زبیرؓ کا سلسلۂ نسب قصی بن کلاب پر رسول اکرمؐ کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے اس طرح وہ حضور کے ہم جد تھے۔

حضرت زبیرؓ ہجرتِ نبوی سے تقریباً اٹھائیس سال قبل پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ چچا نوفل بن خویلد نے اپنی سرپرستی میں ان کی پرورش کی۔ حضرت زبیرؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ بڑی شجاع اور شیر دل خاتون تھیں۔ وہ اپنے فرزند کو بھی ایک سخت کوش بہادر اور نڈر سپاہی بنانے کی آرزومند تھیں۔ چنانچہ وہ حضرت زبیرؓ سے سخت محنت و مشقت کا کام لیتیں اور وقتاً فوقتاً زجر و توبیخ اور زد و کوب سے بھی گریز نہ کرتیں۔ نوفل بن خویلد ایک دن بھتیجے کو ماں کے ہاتھوں پٹتا دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور حضرت صفیہ کو سختی سے

روکا کہ اس طرح تم بچے کو مار ڈالو گی ۔ انھوں نے بنوہاشم سے بھی کہا کہ وہ صفیہ کو بچے پر سختی کرنے سے روکیں ۔ جب اس بات کا چرچا عام ہوا تو حضرت صفیہؓ نے لوگوں کے سامنے یہ رجز پڑھا ۔

من قال ابغضہ فقد کذب انما اضربہ لکے یلب

جس نے یہ کہا کہ میں اس (زبیر) سے بغض رکھتی ہوں اس نے غلط کہا ، میں اس کو اس لیے پیٹتی ہوں کہ عقل مند ہو۔

ویھزم الجیش ویاتی السلب......الخ

اور فوج کو شکست دے اور مال غنیمت حاصل کرے ۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ کو لڑکپن میں ایک جوان آدمی سے مقابلہ پیش آگیا ۔ انھوں نے ایسی ضرب لگائی کہ اس شخص کا ہاتھ ٹوٹ گیا ۔ لوگوں نے حضرت صفیہ سے شکایت کی تو انھوں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ تم نے زبیر کو کیسا پایا بہادر یا بزدل ؟

غرض ماں کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت زبیر بڑے ہو کر ایک دلاور صف شکن اور ضیغم شجاعت بنے ۔

(۳)

حضرت زبیرؓ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس پر آفتاب اسلام کی شعاعیں دعوتِ حق کی ابتدا ہی میں پڑنے لگی تھیں ۔ ان کی پھوپھی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اسلام کی خاتونِ اول تھیں ۔ والدہ حضرت صفیہؓ بھی آغازِ عہد نبوت میں مشرف بہ ایمان ہو گئی تھیں ناممکن تھا کہ نورِ اسلام ان کے نہان خانۂ دل کو منور نہ کرتا چنانچہ انھوں نے باختلافِ روایت آٹھ بارہ یا سولہ برس کی عمر میں ہی دعوتِ حق پر لبیک کہا ۔ بعض مورخین نے اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر چوتھا یا پانچواں لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے ۔ البتہ سابقون اولون میں وہ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ جب تک وہ اسلام نہیں لائے تھے ۔ اپنے چچا کی شفقتوں کا مرجع تھے لیکن جونہی انھوں نے دعوتِ حق قبول کی چچا کا رویہ بدل گیا اور اس نے ان پر سخت مظالم ڈھانے شروع کر دیے ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں ابوالاسود سے روایت کی ہے کہ حضرت زبیرؓ کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ دیتے ، آگ سلگا کر اس کی دھونی دیتے اور کہتے

کہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آ۔ لیکن زبیر ہر بار یہی کہتے "ہرگز نہیں ہرگز نہیں اب میں کبھی کافر نہ ہوں گا۔" جب چچا کی ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی تو حضرت زبیرؓ نے سرورِ عالمؐ کے ایما پر حبش کی ہجرت اختیار کی۔ کچھ عرصہ وہاں گزار کر مکہ واپس آ گئے اور تجارت کا شغل اختیار کیا۔ کچھ مدت بعد خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو ہجرت فرمائی اس وقت حضرت زبیرؓ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے ہوئے تھے۔ جب وہ شام سے مکہ کی طرف واپس آ رہے تھے تو رسولِ اکرمؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے راستہ میں حضرت زبیرؓ کو ان سے شرف نیاز حاصل ہو گیا۔ اس موقع پر انھوں نے حضورؐ اور صدیق اکبرؓ کی خدمت میں کچھ سفید کپڑے ہدیۃً پیش کیے اور پھر مکہ تشریف لے گئے۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد انھوں نے اپنی والدہ حضرت صفیہؓ اور بیوی حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینہ کو ہجرت کی اور کچھ مدت قباء میں قیام پذیر رہے وہیں سنہ ۱ھ میں (اور ایک دوسری روایت کے مطابق سنہ ۲ ہجری میں) حضرت اسماءؓ کے بطن سے حضرت عبداللہؓ ابن زبیر پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے پہلے کئی ماہ تک کسی مہاجر کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی اس لیے یہودِ مدینہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور ان کا سلسلہ نسل منقطع کر دیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ پیدا ہوئے تو مسلمانوں کو بے حد مسرت ہوئی اور انھوں نے فرطِ انبساط میں اس زور سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ مسلمانوں کو زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ولادت باسعادت نے یہودیوں کے دجل و تلبیس کا پردہ چاک کر دیا تھا۔

سرورِ عالمؐ نے مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے مابین عقد مواخاۃ قائم فرمایا تو حضرت زبیرؓ کے اسلامی بھائی حضرت سلمہؓ بن سلامہ بن وقش قرار پائے۔ وہ اوس کے خاندان بنو عبد الاشہل کے ایک معزز رکن تھے اور بیعت عقبۂ کبیرہ کے شرکاء میں سے تھے۔ قیام مدینہ کے ابتدائی چند سالوں میں حضرت زبیرؓ کی معاش کا انحصار زراعت پر رہا۔ رسول اکرمؐ نے انھیں بنو نضیر میں ایک نخلستان اور ایک دوسری جگہ کچھ زمین عطا فرمائی تھی۔ ان کی آمدنی واجبی سی تھی اس لیے بڑی تنگدستی سے گزر ہوتی تھی۔ بعد میں انھوں نے زراعت کے ساتھ تجارت بھی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت دی اور وہ نہایت آسودہ حال ہو گئے۔

(۴)

ہجرت کے بعد غزوات و مشاہد کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت زبیرؓ نے ہر معرکے میں کمال درجے کی استقامت اور بے جگری سے دادِ شجاعت دی۔ کئی موقعوں پر خود ذاتِ رسالتمآبؐ نے ان کی شجاعت اور جذبۂ فدویت کی برملا تعریف و تحسین فرمائی۔ شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰؓ انھیں اشجع العرب کہا کرتے تھے۔ حق و باطل کا معرکہ اول بدر کے میدان میں برپا ہوا تو حضرت زبیرؓ کی شمشیر خارا شگاف دشمن کی صفوں پر برقِ بے اماں بن کر گری اور انھیں درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ جدھر جھک پڑتے تھے دشمن کا دَل بادل کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ اس دن ان کے سر پر زرد عمامہ تھا۔ حضورؐ کی نظر اس پر پڑی تو فرمایا "آج مسلمانوں کی مدد کے لیے ملائکہ بھی زرد عمامے باندھ کر آسمان سے اترے ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ عین ہنگامۂ کارزار میں ایک جنگجو مشرک ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر للکارا "کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے" حضورؐ نے ایک صحابی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا تو اس کے مقابلہ کے لیے جاتا ہے"۔ انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں"

اسی اثنا میں سرورِ عالمؐ کی نظر حضرت زبیرؓ پر پڑی جو قریب ہی بیٹھے تھے اور جوشِ غضب سے کسمسا رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اے ابن صفیہ کھڑے ہو جاؤ اور اس مشرک کے مقابلے پر جاؤ۔ حضرت زبیرؓ تیر کی طرح اس پر جھپٹے اور اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں بڑے شہ زور تھے اور ایک دوسرے کو ٹیلے سے نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا "ان دونوں میں سے جو پہلے گرے گا وہ مارا جائے گا۔ پھر آپ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں دعا فرمائی۔ چند ہی لمحے بعد دونوں لڑھکتے ہوئے نیچے اسی طرح گرے کہ مشرک نیچے تھا اور حضرت زبیر اس کے اوپر اور پھر پلک جھپکنے کی دیر میں حضرت زبیرؓ نے اپنی تلوار سے مشرک کی گردن اڑا دی۔ اس کے بعد حضرت زبیرؓ کا مقابلہ قریش کے نامی بہادر عبیدہ بن سعید بن عاص سے ہوا۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق خود حضرت زبیرؓ نے اس مقابلہ کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "بدر کے دن میرا سامنا عبیدہ بن سعید بن عاص سے ہوا۔ وہ سراپا لوہے میں غرق تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس کی کنیت ابوذات الکرش تھی۔ اس نے للکار کر کہا، میں ہوں ابو ذات الکرش۔ میں نے اپنی برچھی سے اس پر حملہ کیا اور تاک کر اس کی آنکھ میں برچھی ماری، وہ مر گیا۔"

جب حضرت زبیرؓ الرذات الکرش کو ہلاک کر چکے تو اپنی برچھی کو اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر بڑی مشکل سے اس طرح نکالا کہ برچھی کا پھل مڑ گیا۔ سرورِ کائنات نے یہ برچھی حضرت زبیرؓ سے مانگ لی اور تا وفات اپنے پاس رکھی۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد حضرت زبیرؓ نے اس برچھی کو واپس لے لیا لیکن ان سے صدیق اکبرؓ نے مانگ لی۔ پھر یہ برچھی فاروق اعظمؓ کے قبضہ میں آئی۔ فاروق اعظمؓ کے بعد حضرت زبیرؓ نے یہ برچھی پھر واپس لے لی تھی۔ لیکن امیر المومنین عثمانؓ ذو النورین نے ان سے طلب کر لی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ برچھی آلِ علی کے پاس پہنچی۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان سے لے لی اور تا زندگی اپنے پاس رکھی۔

حضرت زبیرؓ کی جو تلوار بدر کے میدان میں چمکی وہ بھی اس برچھی کی طرح یادگار بن گئی۔ بدر کے دن حضرت زبیرؓ نے از خود رفتگی کے عالم میں یہ تلوار اس طرح چلائی کہ اس میں دندانے پڑ گئے۔ اس تلوار میں چاندی کا کام تھا۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کے بعد یہ تلوار ان کے جلیل القدر فرزند حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے قبضہ میں آئی۔ صحیح بخاری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان اموی نے مجھے بلا کر پوچھا: "اے عروہ کیا تم زبیرؓ کی تلوار کو پہچانتے ہو؟" میں نے کہا: ہاں۔ عبدالملک نے پوچھا، اس کی نشانی کیا ہے؟ میں نے کہا۔ بدر کے دن اس میں دندانے پڑ گئے تھے۔

عبدالملک نے کہا: ہاں سچ کہتے ہو اس میں لشکروں کی مڈ بھیڑ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

پھر اس نے یہ تلوار مجھے دے دی۔

عروہؓ کے فرزند ہشام کا بیان ہے کہ عروہ کے بعد اس مقدس تلوار کے متعلق آلِ زبیرؓ میں مناقشت پیدا ہوئی۔ ہم نے باہم اس کی قیمت تین ہزار درہم لگائی اور ہم میں سے ایک نے اس کو لے لیا۔ کاش میں نے اس تلوار کو لے لیا ہوتا۔

غزوۂ بدر میں حضرت زبیرؓ کو تلوار کے (باختلاف روایت) ایک یا دو زخم کاندھے پر آئے۔ ایک زخم اتنا شدید تھا کہ اس کے مندمل ہونے پر وہاں گڑھا سا بن گیا۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ میں بچپن میں اس گڑھے میں اپنی انگلیاں ڈال کر کھیلا کرتا تھا۔

(۵)

غزوہ اُحد میں حضرت زبیرؓ ان چودہ ثابت قدم صحابہ کرام میں سے ایک تھے جو شروع سے آخر تک سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سپر بنے رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ حافظ ابن کثیرؒ نے یونس بن اسحاق سے روایت کی ہے کہ احد کے دن طلحہ بن ابی طلحہ مشرکین کا علمبردار تھا۔ اس نے میدانِ جنگ میں آکر مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی۔ حضرت زبیرؓ دوڑتے ہوئے اس کی طرف گئے اور جست لگا کر اس کے اونٹ پر سوار ہو گئے پھر اس کو زمین کی طرف دھکیل کر اونٹ سے گرا دیا اور اپنی تلوار سے اس کو ذبح کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ کی تعریف فرمائی اور فرمایا "ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔ اگر زبیر اس کے مقابلے کے لیے نہ نکلتا تو میں خود اس کے مقابلے پر جاتا۔" (البدایہ والنہایہ)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زبیرؓ نے طلحہ کو نہیں بلکہ اس کے بیٹے کلاب بن طلحہ کو قتل کیا تھا اور طلحہ بن ابی طلحہ کے قاتل حضرت علیؓ مرتضیٰ تھے۔ بہر حال میدانِ اُحد میں حضرت زبیرؓ کے ہاتھ سے مشرکین کا ایک نامی جنگجو ضرور قتل ہوا۔

اثنائے جنگ میں ایک موقع پر سرورِ عالمؐ نے اپنی شمشیر مقدس نیام سے کھینچی اور فرمایا "کون ہے جو آج اس کا حق ادا کرے؟"

حضرت زبیرؓ اور حضرت ابودجانہ انصاریؓ نے تین مرتبہ اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ بالآخر حضورؐ نے یہ تلوار حضرت ابودجانہؓ کو عطا فرمائی۔ تاہم حضرت زبیرؓ کا جذبۂ فدویت تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ گیا۔

صحیح بخاری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُحد میں زخم لگے اور مشرکین واپس چلے گئے تو آپؐ نے اس خیال سے کہ کہیں وہ پلٹ نہ پڑیں، فرمایا "کون ان کے تعاقب میں جاتا ہے؟" صحابہؓ میں سے ستر آدمی اس کام کے لیے آمادہ ہوئے ان میں حضرت زبیرؓ بھی تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عروہؓ کی زبانی حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ قول منقول ہے کہ آیت اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ ان صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں غزوہ احد کے بعد مشرکین کا تعاقب کیا۔ ان میں حضرت

زبیرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی تھے۔

(۶)

۵ھ میں فرزندانِ توحید کو خندق کی پر صعوبت جنگ پیش آئی۔ اس موقع پر مشرکین کا ایک سیلاب عظیم مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوا۔ سرورِ کائنات نے مدینہ کے گرد خندق کھود کر اس لشکر کا مقابلہ کیا۔ مشرکین کا محاصرہ تقریباً تین ہفتے جاری رہا۔ اس دوران میں اگرچہ کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی لیکن فریقین میں وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ابن اسحاق کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ غزوۂ احزاب کے دوران میں ایک دن نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی نے اپنی لشکر گاہ سے باہر نکل کر مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ حضرت زبیرؓ جھپٹ کر اس کے مقابل ہوئے اور اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس موقعہ پر ان کی تلوار میں ایک دندانہ پڑ گیا۔ نوفل کو جہنم واصل کرنے کے بعد حضرت زبیرؓ یہ رجز پڑھتے ہوئے واپس آئے۔

انی امرء احمی واحتمی — عن النبی المصطفیٰ الامّی

(میں وہ شخص ہوں جو اپنی بھی حفاظت کرتا ہوں اور نبی مصطفیٰ امّی کی بھی حفاظت کرتا ہوں)

یہود بنی قریظہ اور مسلمانوں میں باہم خیرسگالی کا معاہدہ تھا لیکن جنگ خندق کے موقع پر یہودیوں کی نیت بدل گئی اور وہ مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اہلِ حق کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ حضورؐ کو ان غداروں کے فاسد عزائم کا علم ہوا تو آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا۔ "کون بنی قریظہ کی خبر لاتا ہے؟"

حضرت زبیرؓ نے بڑھ کر عرض کی۔ "یا رسول اللہ میں جاتا ہوں۔"

سرورِ عالمؐ نے تین مرتبہ اپنے الفاظ دہرائے اور تینوں مرتبہ حضرت زبیرؓ نے اپنے آپ کو اس پرخطر کام کے لیے پیش کیا۔ حضورؐ ان کے جذبۂ فدویت سے بہت خوش ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔"

بخاری ہی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ غزوۂ احزاب میں عمر ابن ابی سلمہ اور میں عورتوں کے ساتھ کر دیے گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ زبیر گھوڑے پر سوار دو یا تین مرتبہ بنی قریظہ کی طرف گئے اور واپس آئے۔ جب (شام کو) میری ان سے ملاقات ہوئی تو

میں نے کہا، ابا جان میں نے آپ کو (بنی قریظہ کی طرف) جاتے دیکھا تھا۔ حضرت زبیرؓ نے فرمایا۔ بیٹا تم نے مجھے دیکھا تھا؟ میں نے کہا۔ ہاں۔ حضرت زبیرؓ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کون بنو قریظہ کی خبر لاتا ہے۔ میں گیا جب واپس آیا تو حضورؐ نے میرے لیے اپنے ماں باپ جمع کیے اور فرمایا فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي (میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں)

اکثر اہل سیر کا بیان ہے کہ "فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي" کے الفاظ لسانِ رسالتؐ سے حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے سوا کسی اور کے لیے نہیں نکلے۔ جنگِ خندق کا یہ انجام ہوا کہ بائیس دن کے محاصرے کے بعد کفار آسمانی آفات اور مسلمانوں کی غیر معمولی استقامت کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

(۷)

غزوہ احزاب کے فوراً بعد حضرت زبیرؓ غزوہ بنی قریظہ میں شریک ہوئے اور پھر ذیقعدہ ۶ھ میں بیعتِ رضوان کا عظیم شرف حاصل کیا۔ اواخر ۶ھ یا شروع ۷ھ میں خیبر کی جنگ پیش آئی تو اس میں بھی حضرت زبیرؓ نے کمال درجے کی جانبازی اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ مورخ ابن ہشام کا بیان ہے کہ جب رئیسِ خیبر مرحب حضرت علیؓ مرتضیٰ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا قوی ہیکل اور جنگجو بھائی یاسر غضب ناک ہو کر میدان میں آیا۔ حضرت زبیرؓ اس کے مقابلے کے لیے بڑھے۔ ان کا قد و قامت یاسر کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج یاسر کے ہاتھ سے نہیں بچیں گے۔ ان کی والدہ حضرت صفیہؓ بھی حضورؐ کے ساتھ مدینے آئی تھیں، انھوں نے بے قرار ہو کر حضورؐ سے عرض کیا: "یارسول اللہ آج میرا جگر گوشہ شہید ہو گا۔"

سرورِ عالمؐ نے فرمایا: "نہیں انشاء اللہ وہ دشمن پر غالب آئے گا۔" چنانچہ تھوڑی دیر کی لڑائی کے بعد حضرت زبیرؓ نے یاسر کو قتل کر دیا۔

(۸)

۸ھ میں جب دس ہزار قدوسیوں کا لشکر مکہ میں فاتحانہ داخل ہوا تو اس موقع پر حضرت زبیرؓ کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ مہاجرین کے علمبردار مقرر ہوئے اور خاص علمِ نبوی انھیں تفویض کیا صحیح بخاری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے فتحِ مکہ کے بارے میں روایت ہے کہ "ایک فوج آئی جس کی تعداد دوسرے تمام دستوں سے کم تھی۔ اس میں رسول اللہؐ اور اصحاب تھے اور علمِ نبوی زبیرؓ بن العوام کے پاس تھا۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت زبیرؓ اسلامی لشکر کے میسرہ کے سردار تھے۔
لیکن اکثر اہل سیر نے بخاری کی روایت کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ سب سے آخری اور سب سے چھوٹے دستے میں تھے۔ رحمتِ عالم بھی اسی دستے میں رونق افروز تھے۔ مورخ ابن سعد کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ہر طرف امن و سکون ہو گیا تو حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ بن الاسود کندی اپنے گھوڑوں پر سوار بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ان کے چہروں سے گرد صاف کی۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

فتح مکہ کے بعد حنین کا خونی معرکہ پیش آیا۔ حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں بھی اپنی شجاعت و بسالت کے خوب جوہر دکھلائے۔ ایک موقع پر بہت سے مشرکین ایک گھاٹی سے نکل کر دفعتہً حضرت زبیرؓ پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت زبیرؓ تن تنہا اس جرأت اور استقامت کے ساتھ لڑے کہ کفار کا منہ پھر گیا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ حنین کے بعد حضرت زبیرؓ نے طائف اور تبوک کے غزوات میں شرکت کی پھر حجۃ الوداع میں انھیں سرورِ عالم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

(۹)

سنہ ۱۱ھ میں سرورِ کائنات نے رحلت فرمائی تو حضرت زبیرؓ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا اور انھوں نے شکستہ دل ہو کر عزلت گزینی اختیار کر لی۔ شروع شروع میں خلافت کے معاملے میں انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حمایت کی (حالانکہ حضرت ابوبکرؓ صدیق ان کے خسر تھے) لیکن پھر ان کا خیال بدل گیا اور کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جمہور مسلمین کی طرح حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت کر لی۔
دو تین سال انھوں نے نہایت خاموشی سے گزارے لیکن فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ان کے خون نے جوش مارا اور وہ اپنے کم سن فرزند عبداللہ کو ساتھ لے کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے شام پہنچ گئے اس وقت شام کی فیصلہ کن جنگ یرموک کے میدان میں لڑی جا رہی تھی۔ حضرت زبیرؓ نے اس جنگ میں حیرت انگیز جرأت و بسالت کا مظاہرہ کیا۔ صحیح بخاری میں ان کے فرزند عروہؒ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول نے جنگ یرموک میں زبیرؓ سے کہا، آپ شدت کیوں نہیں کرتے تاکہ ہم بھی شدت کریں۔ انھوں نے کہا، اگر میں شدت کروں گا تو تم جھوٹے ثابت ہو گے (یعنی میرا ساتھ نہ دے سکو گے) لوگوں نے کہا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ حضرت زبیرؓ نے کفار پر ایک شدید حملہ کیا اور ان کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے آگے نکل گئے لیکن ان کا ساتھ کوئی مسلمان نہ دے سکا۔ جب واپس آنے لگے تو کفار

نے ان کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور ان کے کندھے پر دو زخم لگائے۔ ان کے درمیان ایک اور زخم تھی جو بدر میں لگی تھی۔ "میں بچپن میں ان ضربوں (کے گڑھوں) میں اپنی انگلیاں داخل کر کے کھیلا کرتا تھا" یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ واقدی طبری اور کئی دوسرے مورخین نے جنگِ یرموک میں حضرت زبیرؓ کی جانبازی اور شجاعت کے کئی اور واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خونیں جنگ کے ابطالِ خاص میں تھے۔

فتح شام کے بعد مجاہدینِ اسلام نے حضرت عمروؓ بن العاص کی قیادت میں مصر پر چڑھائی کی اور وہاں کے مشہور شہر فسطاط کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ فسطاط کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور مجاہدین کی تعداد بہت قلیل تھی اس لیے حضرت عمرو بن العاص نے امیر المومنین سے مدد مانگ بھیجی۔ فاروقِ اعظمؓ نے چار ہزار فوج حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عبادہؓ بن صامت، حضرت مقدادؓ بن اسود کندی اور حضرت مسلمہؓ بن مخلد کی سرگردگی میں روانہ کی اور حضرت عمروؓ کو لکھا کہ ان میں سے ہر افسر ایک ہزار سوار کے برابر ہے اس لیے اس فوج کو آٹھ ہزار سمجھنا" مصریوں کا دفاع اس قدر مضبوط تھا کہ اس فوج کے پہنچنے کے باوجود قلعہ سات ماہ تک فتح ہونے میں نہ آیا۔ ایک دن حضرت زبیرؓ کو سخت جوش آیا اور وہ سیڑھی لگا کر شمشیر بدست قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے۔ چند اور مجاہدین نے بھی ان کا ساتھ دیا اور فصیل پر پہنچ کر ایک فلک شگاف نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ نیچے کی فوج نے بھی نعرے لگانے شروع کر دیے۔ عیسائی سراسیمہ ہو گئے اسی اثناء میں حضرت زبیرؓ نے فصیل سے اتر کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اس کے ساتھ ہی تمام اسلامی لشکر اندر گھس آیا۔ عیسائیوں نے ہتھیار پھینک دیے اور امان طلب کی۔ حضرت عمروؓ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور فسطاط پر اسلامی علم لہرا دیا۔

فسطاط کی فتح کے بعد حضرت زبیرؓ نے سکندریہ کی تسخیر میں نمایاں حصہ لیا۔ سکندریہ کا قلعہ اپنے زبردست انتظامات کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر متصور ہوتا تھا۔ اسلامی فوجیں مدت سے اس کا محاصرہ کیے پڑی تھیں۔ آخر ایک دن حضرت زبیرؓ اور مسلمہؓ بن مخلد نے فوج کے چند مضبوط دستے اپنے ہمراہ لیے اور اس زور شور سے حملہ کیا کہ دشمن کے لیے اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

(۱۰)

۲۳ھ میں سیدنا فاروق اعظمؓ نے جامِ شہادت پیا۔ آپ نے اپنی شہادت سے پہلے حضرت

عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام مسلمانوں کے سامنے پیش کرکے وصیت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان چھ بزرگوں سے آخر وقت تک راضی رہے تھے اس لیے بہتر ہوگا کہ ان چھ میں سے ایک کو میرے بعد منصب خلافت پر فائز کیا جائے۔ ان سب نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اپنا حکم بنایا۔ انھوں نے ہر شخص سے انفرادی رائے لینے کے بعد حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ دیا۔ حضرت زبیرؓ نے اس انتخاب کو فوراً تسلیم کر لیا۔ اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حضرت زبیرؓ نے ایثار سے کام لے کر حضرت علیؓ کے حق میں رائے دی تھی لیکن کثرتِ آراء حضرت عثمانؓ کے حق میں تھی۔ چنانچہ انھوں نے مجلسِ شوریٰ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت زبیرؓ نے پھر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہر قسم کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہوگئے لیکن عامۃ المسلمین میں ان کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ ایک بار حضرت عثمانؓ شدت نکسیر کی وجہ سے حج سے معذور ہوگئے (بلکہ زندگی سے مایوس ہو گئے) تو لوگوں کے مطالبہ پر انھوں نے حضرت زبیرؓ کو امیر حج اور اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اس موقع پر انھوں نے قسم کھا کر لوگوں سے یہ بھی کہا کہ بے شک زبیر تم لوگوں میں بہتر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے زیادہ محبوب تھے۔ (صحیح بخاری کتاب المناقب)

سنہ ۳۵ھ میں مفسدین نے مدینہ منورہ پر اپنی حکومت قائم کرلی اور بارگاہِ خلافت کا محاصرہ کر لیا۔ اس نازک موقع پر حضرت زبیرؓ نے اپنے بڑے فرزند عبداللہؓ کو بارگاہِ خلافت کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ لیکن ایک دن باغی دوسری طرف سے دیوار پھلانگ کر کاشانۂ خلافت میں داخل ہو گئے اور امیر المومنین حضرت عثمانؓ ذوالنورین کو نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔ حضرت زبیرؓ کو امیر المومنین کی مظلومانہ شہادت سے سخت صدمہ پہنچا۔ ادھر مفسدین کی شقاوت قلبی کا یہ عالم تھا کہ وہ امیر المومنین کی تجہیز و تکفین کے بھی روادار نہ تھے۔ آخر حضرت زبیرؓ اور چند دوسرے مسلمانوں نے جان پر کھیل کر حضرت عثمان شہید کی تجہیز و تکفین کی۔ پھر رات کے وقت پوشیدہ طور پر حضرت زبیرؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور مضافاتِ مدینہ میں حش کوکب کے مقام پر انھیں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد سیدنا علی مرتضیٰؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کے عہدِ خلافت کے اوائل ہی میں حالات و واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ قصاص عثمانؓ کے سلسلے میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلے میں اصلاح کا علم

بلند کر دیا ۔ حضرت زبیرؓ ، حضرت طلحہؓ اور کئی دوسرے صحابہ ام المومنینؓ کے پر جوش حامیوں میں تھے ۔ دوسری طرف امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ کے ساتھ بھی جلیل القدر صحابہ کی ایک کثیر تعداد تھی ۔ ۱۰ جمادی الثانی ۳۶ھ کو اپنے وقت کے بہترین انسانوں کے مابین جمل کی انتہائی افسوسناک لڑائی پیش آئی ۔ مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق لڑائی کے آغاز سے پہلے سیدنا علی مرتضیٰ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لائے اور حضرت زبیرؓ کو پکار کر کہا " ابو عبداللہ ۔ کیا تمھیں وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رسول اللہ کے سامنے سے گزرے تھے ، حضورؐ نے تم سے سوال کیا تھا ، کیا تم علی کو دوست رکھتے ہو ؟ جب تم نے اثبات میں جواب دیا تو حضورؐ نے فرمایا تھا ، ایک دن تم ناحق علی سے لڑو گے ۔"

حضرت زبیرؓ نے جواب دیا :۔ ہاں مجھے یاد آ گیا ۔

حضرت علیؓ تو یہ بات یاد دلا کر اپنے لشکر میں واپس چلے گئے لیکن حضرت زبیرؓ کے دل کی دنیا بدل گئی اسی وقت میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو کر بصرہ روانہ ہو گئے ۔ ایک شخص عمرو ابن جرموز نے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کا تعاقب کیا ۔ حضرت زبیرؓ نے بصرہ پہنچ کر اپنے غلاموں کو سامان و اسباب کے ساتھ روانہ ہونے کی ہدایت کی اور خود بصرہ کی آبادی سے دور نکل آئے ۔ اس وقت ابن جرموز گھوڑا دوڑا کر ان کے قریب پہنچا اور پوچھا :۔ ابو عبداللہ آپ نے قوم کو کس حال میں چھوڑا ؟

حضرت زبیرؓ ۔ لوگ ایک دوسرے کا خون بہانے پر تلے ہوئے تھے ۔

ابن جرموز :۔ آپ کہاں جا رہے ہیں ؟

حضرت زبیرؓ :۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اب میں اس ہنگامے سے کنارہ کش ہو کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں ۔

ابن جرموز نے کہا تو چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں ۔ کچھ دور جانے کے بعد ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ۔ حضرت زبیرؓ نماز پڑھنے کے لیے ٹھہر گئے ۔ ابن جرموز نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھوں گا ۔

حضرت زبیرؓ نے فرمایا :۔ میں تمھیں امان دیتا ہوں کیا تم بھی میرے حق میں ایسا ہی کرو گے ؟

ابن جرموز نے کہا :۔ یقیناً ۔

اس عہد و پیمان کے بعد دونوں گھوڑوں سے اتر کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ حضرت زبیرؓ

جونہی سجدے میں گئے۔ عمرو بن جرموز نے غداری کرکے ان کی گردن پہ وار کیا اور حواریٔ رسول کا سرِ اقدس تن سے جدا کردیا۔ اس کے بعد وہ حضرت زبیرؓ کی زرہ، تلوار اور سر لے کر امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے توقع تھی کہ امیر المومنینؓ اس کے کام کو سراہیں گے لیکن شیرِ خدا نے حضرت زبیرؓ کی تلوار پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور فرمایا:

"اس تلوار نے بارہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے بادل ہٹائے۔ اے ابن صفیہؓ کے قاتل تجھے جہنم کی بشارت ہو"

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ابن جرموز نے مایوسی کے عالم میں یہ شعر کہے ؎

أَتَيْتُ عَلِيًّا بِرَأْسِ الزُّبَيْرِ ... وَأَرْجُوْ لَدَيْهِ بِهِ الزُّلْفَةَ
فَبَشَّرَ بِالنَّارِ إِذْ جِئْتُهُ ... فَبِئْسَ الْبِشَارَةُ وَالتُّحْفَةُ

ترجمہ: میں علیؓ کے پاس زبیرؓ کا سر لے کر حاضر ہوا مجھے اس کام سے ان کے تقرب کی امید تھی۔ جب میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے مجھے جہنم کی بشارت دی۔ سو کیسی بری بشارت اور کیسا برا تحفہ ہے۔

شہادت کے وقت حضرت زبیرؓ کی عمر چونسٹھ برس کی تھی۔ اپنی جائے شہادت وادی السباع ہی میں دفن کیے گئے۔ اس المیہ سے چند سال پہلے حضرت زبیرؓ اور حضرت اسماءؓ کے درمیان بعض اسباب کی بنا پر علیحدگی ہو چکی تھی لیکن جب ان کی شہادت کی خبر حضرت اسماءؓ نے سنی تو فرطِ الم سے نڈھال ہو گئیں اور بے اختیار ان کی زبان پر یہ مرثیہ جاری ہو گیا۔

غدر ابن جرموز بفارس بهمة ... يوم اللهياج وكان غير معدد
يا عمرو لو نبهته لوجدته ... لا طائشاً رعش الجنان ولا اليد
ثكلتك امك ان قتلت لمسلما ... حلت عليك عقوبة المتعمد

(در منثور)

یعنی ابن جرموز نے لڑائی کے دن ایک عالی ہمت شہسوار سے غداری کی اور غداری بھی ایسی حالت میں کہ وہ نہتا اور بے سروسامان تھا۔

اے عمرو اگر تو اس کو پہلے سے خبردار کر دیتا تو اس کو ایسا شخص پاتا کہ نہ اس کے دل میں خوف ہوتا اور نہ ہاتھ میں لرزہ۔

تیری ماں تجھ پر روئے تو نے ایک مسلمان کو (ناحق) قتل کیا۔ تجھ پر ضرور اللہ کا عذاب

نازل ہو گا۔

(۱۲)

حضرت زبیرؓ نے اپنی زندگی میں مختلف اوقات میں سات شادیاں کیں۔ ازواج کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ۔
۲۔ حضرت ام خالدؓ بنت خالد بن سعید بن عاص
۳۔ رباب بنت انیف
۴۔ زینب بنت مرثد
۵۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ
۶۔ حلال بنت قیس
۷۔ عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل

صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے اپنے پیچھے چار بیویاں، نو لڑکے اور نو لڑکیاں چھوڑیں۔ لڑکوں میں حضرت عبد اللہؓ، عروہؒ، منذرؒ (جو حضرت اسماءؓ کے بطن سے تھے) اور حضرت مصعبؒ (جو رباب بنت انیف کے بطن سے تھے) اپنی اسلامی اور علمی خدمات کی بنا پر ہمہ گیر شہرت کے مالک ہوئے۔

حضرت زبیرؓ کا قد اتنا طویل تھا کہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو پاؤں زمین سے چھو جاتے، رنگ گندمی، بدن چھریرا، سر پر گھنے بال۔ ڈاڑھی ہلکی (یعنی اس میں بال کم تھے)

سرورِ عالمؐ نے حضرت زبیرؓ کو نواح مدینہ میں کچھ زمین عطا فرمائی تھی جسے وہ خود آباد کرتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد حضورؐ نے انہیں بنو نضیر کا ایک نخلستان عطا فرمایا۔ صدیق اکبرؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو انھوں نے حضرت زبیرؓ کو مقامِ جرف میں ایک جاگیر عطا کی۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں عقیق میں ایک شاداب اور سرسبز قطعۂ زمین دیا۔ بدری صحابی ہونے کی بنا پر انھیں حکومت کی جانب سے معقول وظیفہ ملتا تھا۔ وقتاً فوقتاً مالِ غنیمت سے بھی کافی حصہ مل جاتا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں بے حد برکت عطا کی تھی۔ اس طرح وہ اغنیا کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ زمین کے علاوہ مختلف مقامات پر ان کے پندرہ مکانات بھی تھے (گیارہ مدینہ میں، دو بصرہ میں، ایک کوفہ میں اور ایک مصر میں) شہادت کے وقت ان کی غیر منقولہ جائداد کی قیمت کا تخمینہ پانچ کروڑ دو لاکھ

درہم کیا گیا۔ لیکن اپنی بے مثال فیاضی اور سخاوت کی بدولت وہ بائیس لاکھ درہم کے مقروض ہو گئے تھے۔ شہادت کے بعد یہ قرض ان کی جائداد سے ادا کیا گیا۔

(۱۳)

سیدنا حضرت زبیرؓ فضائل و مناقب کے آسمان کے مہر درخشندہ ہیں، ہر وہ شرف اور اعزاز جو دورِ رسالت کے کسی مسلمان کا طرۂ افتخار ہو سکتا تھا انھیں حاصل ہوا۔ ان کے تقدم فی الدین کی یہ شان تھی کہ بارہ یا سولہ برس کی عمر میں اس وقت لوائے حق کو تھاما جب ایسا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا، اسی پُر آشوب دور میں سب سے پہلے سید الانامؐ کی حمایت میں تلوار بلند کی، راہِ حق میں ہر قسم کے مصائب سہے، دو ہجرتوں کی سعادت حاصل کی۔ بدر سے تبوک تک ہر غزوے میں حیرت انگیز پامردی اور سرفروشی کا ثبوت دیا۔ راہِ حق میں اتنے زخم کھائے کہ جسم کا کوئی ظاہری اور پوشیدہ حصہ ایسا نہ تھا جو زخموں کے نشان سے خالی ہو، حواریٔ رسول کا عظیم الشان لقب حاصل کیا، بیعت رضوان سے سعادت اندوز ہوئے۔ لسانِ رسالتؐ سے جنت کی نوید پائی۔ جہاد شام و مصر میں عدیم المثال شجاعت و شہامت کا مظاہرہ کیا، جام شہادت پیا تو وہ بھی اس شان سے کہ سر سجدے میں تھا اور زبان پر تکبیر۔

حضرت زبیرؓ کا چمن اخلاق بھی رنگا رنگ کے پھولوں سے آراستہ تھا۔ انفاق فی سبیل اللہ، زہد و تقویٰ، خشیتِ الٰہی، عبرت پذیری، ایثار اور امانت داری اس چمن کے سب سے خوش رنگ پھول تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت زبیرؓ نے اپنے تمام (پندرہ کے پندرہ) مکانات راہِ حق میں صدقہ (وقف) کر دیے تھے۔ اسی طرح بیہقیؒ نے مغیث بن سمیؒ سے اور ابو نعیمؒ نے سعید بن عبد العزیزؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت زبیرؓ کے ایک ہزار غلام تھے جو ان کو یومیہ خراج ادا کرتے تھے (یعنی وہ جو کام کرتے تھے اس کی اجرت کا مقررہ حصہ حضرت زبیرؓ کو دیتے تھے) حضرت زبیرؓ اس تمام رقم کو فوراً خیرات کر دیتے تھے اور اپنے گھر میں اس طرح داخل ہوتے تھے کہ ان کے پاس ایک درہم بھی نہ ہوتا تھا۔

حضرت زبیرؓ کی دیانت اور امانت کا اس قدر شہرہ تھا کہ لوگ نہ صرف اپنا مال و متاع ان کے پاس امانت رکھتے تھے بلکہ اپنی وفات کے وقت انھیں اپنی اولاد اور مال کا محافظ بنانے کی آرزو کرتے تھے چنانچہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اور حضرت عبد الرحمانؓ بن عوف جیسے جلیل القدر صحابہؓ نے انھیں اپنا وصی بنایا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہؓ

بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ حضرت زبیرؓ پر قرض اس لیے ہو گیا تھا کہ لوگ ان کے پاس مال لے کر آتے تھے اور امانتہً رکھا دیتے تھے۔ زبیرؓ کہتے تھے کہ یہ امانت نہیں بلکہ سلف ہے کیونکہ مجھے اس کے ضائع (خرچ) ہو جانے کا خوف ہے۔

زہد و تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا یہ عالم تھا کہ ہر بات میں سنتِ نبوی کا اتباع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور معمولی سے معمولی واقعہ پر خوفِ خدا سے کانپ اٹھتے تھے۔ قرآن حکیم کی کوئی ایسی آیت سنتے جس میں قیامت کا ذکر ہوتا تو لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ حضرت زبیرؓ اگرچہ حواری رسول تھے اور سالہا سال تک فیضانِ رسالت سے خوشہ چینی کی تھی لیکن کمالِ اتّقا کے باعث وہ بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی قلتِ روایت کا سبب اس طرح بیان کیا ہے۔

"میں نے زبیرؓ سے کہا، میں آپ کو رسول اللہؐ سے حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں سنتا۔ جس طرح فلاں اور فلاں حدیث بیان کرتے ہیں۔ فرمایا میں نے حضورؐ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا لیکن آپ کو فرماتے ہوئے سنا ہے جو مجھ پر جھوٹ بولے (مجھ سے کوئی غلط بات منسوب کرے) اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

حضرت زبیرؓ سے کل اڑتیس حدیثیں مروی ہیں ان میں سے بھی اکثر کا تعلق اخلاق سے ہے۔

فاروق اعظمؓ نے اپنی شہادت سے پہلے جن چھ بزرگوں کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا ان میں حضرت زبیرؓ بھی تھے لیکن انھوں نے اپنے سراپا ایثار ہونے کا ثبوت یوں دیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں دست بردار ہو گئے اور جب مجلس شوریٰ نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے حق میں فیصلہ دیا تو انھوں نے بلا چون و چرا حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی۔

حضرت زبیرؓ صحیح معنوں میں مردِ مومن تھے اور کسی شخص کو اچانک یا دھوکے سے قتل کرنا کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مسند احمد حنبل میں ہے کہ جب انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ دعوتِ اصلاح کا علم بلند کیا تو کسی شخص نے ان سے کہا کہ آپ کا ایما ہو تو علیؓ کو قتل کر ڈالوں، بولے تم یہ کام کیسے کرو گے۔ علیؓ کے پاس تو زبردست فوج ہے۔ اس نے کہا کہ میں علیؓ کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہو جاؤں گا اور کسی وقت موقع پا کر ان کی گردن اڑا دوں گا فرمایا ہرگز نہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایمان قتلِ ناگہانی کی زنجیر ہے اس لیے کوئی مومن کسی کو اچانک قتل نہ کرے۔"

حضرت زبیرؓ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس قصیدہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو ایک موقع پر شاعرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسانؓ بن ثابت نے ان کی شان میں موزوں کیا اور اس میں حضرت زبیرؓ کے فضائل نہایت بلیغ پیرائے میں بیان کیے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

أَقَامَ عَلَىٰ عَهْدِ النَّبِيِّ وَهَدْيِهِ
حَوَارِيُّهُ وَالْقَوْلُ بِالْفِعْلِ يُعْدَلُ

وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور سنت پر قائم رہے۔ وہ حضور کے حواری ہیں اور قول عمل ہی سے سچ سمجھا جاتا ہے۔

هُوَ الْفَارِسُ الْمَشْهُورُ وَالْبَطَلُ الَّذِي
يَصُولُ إِذَا مَا كَانَ يَوْمٌ مُحَجَّلُ

وہ ایسے مشہور شہسوار اور بہادر ہیں کہ جو اس دن حملہ کرتے تھے جب لوگ (جنگ کے) خوف سے چھپتے پھرتے تھے۔

لَهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ قُرْبَىٰ قَرِيبَةٌ
وَمِنْ نُصْرَةِ الْإِسْلَامِ مَجْدٌ مُؤَثَّلُ

ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابتِ قریبہ حاصل تھی اور یہ وہی ہیں جن سے اسلام کو نصرت حاصل ہوئی۔

فَكَمْ كُرْبَةٍ ذَبَّ الزُّبَيْرُ بِسَيْفِهِ
عَنِ الْمُصْطَفَىٰ وَاللهُ يُعْطِي وَيُجْزِلُ

چنانچہ بہت سے مصائب زبیرؓ نے اپنی تلوار سے (محمد) مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دور کیے اور اللہ بہت عطا اور بخشش کرنے والا ہے۔

إِذَا كَشَفَتْ عَنْ سَاقِهَا الْحَرْبُ حَشَّهَا
بِأَبْيَضَ سَبَّاقٍ إِلَى الْمَوْتِ يُرْقِلُ

جب لڑائی اپنی آگ روشن کرتی تھی تو شمشیر بدست موت کی طرف دوڑتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تعارف و تبصرہ کتب

کتاب	پیارے نبیؐ کی پیاری زبان عربی بذریعہ خط و کتابت
تالیف	مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی
تہذیب و ترتیب	جناب حافظ نذیر احمد صاحب
ناشر	پرنسپل عربی خط و کتابت سکول ۱۸/۲۹ محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، لاہور
قیمت اور فیس	مبلغ بیس روپیہ فیس امتحان و سند مبلغ دس روپیہ (کل ۳۰/- روپے)
سائز، ضخامت	۲۰×۳۰/۱۶ کتابی سائز۔ صفحات ۲۷۶ سفید کاغذ۔ ونڈاٹک چھپائی۔ جلد پیپر بیک
مضمون	۵۵ اسباق پر مشتمل پہلا کورس، جس کی مدد سے عربی زبان پانچ ماہ یا اس سے بھی کم مدت میں گھر بیٹھے سیکھ سکتے ہیں۔

کتاب کی تالیف کے اولین مقاصد یہ ہیں کہ قرآن مجید کے ترجمہ کی استعداد پیدا ہو جائے اور عربی زبان میں گفتگو کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔

نیز عرب اور افریقی ممالک جانے والے لوگوں کے لیے یہ کورس بے حد مفید ثابت ہو گا بہرحال کتاب حمید اور دیارِ حبیب کی زبان فہمی کے لیے خط و کتابت سکول کی یہ پیشکش مبارک پیش کش ہے۔ اس پر ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور ہر مسلمان سے یہ سفارش کرتے ہیں کہ یہ کورس حاصل کر کے عربی سے مناسبت حاصل کریں۔ کیونکہ یہ زبان قرآن پاک کی زبان ہے اور حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ تاکہ کل یہ اعتراض اور ندامت نہ ہو کہ ؎

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

مولانا سورتی عربی گرامر کو عام فہم زبان میں پیش کرنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اور حافظ صاحب موصوف تہذیب و ترتیب میں، اس لیے یہ مرقع خاصا دلچسپ اور مفید بن گیا ہے۔

ہر سبق میں آٹھ سے دس نئے لفظ اور دو یا تین قاعدے ہیں، سبق کے ساتھ دو یا تین مشقیں ہیں۔

آخر میں تمام مشقوں کے حل، پوری کتاب کی فرہنگ (معجم) اور نہایت مفید ضمیمے اور چارٹ دیے گئے ہیں۔

نیز خط و کتابت سکول نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ چند امتحانی پرچے کامیابی سے حل کرنے کے بعد:

تبصرہ نگار۔ (عزیز زبیدی)

Regd. No. L. 7895 Phones : 352897 - 63210

Monthly MOHADDIS Lahore-16

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL